ربیع الثانی ۱۴۴۷ھ

اکتوبر ۲۰۲۵ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تکبیرِ ربّ کا حقیقی مفہوم

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

خود احتسابی: زندہ قوموں کا شعار

حافظ عاکف سعید

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کے دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت کے بعد اب پیش ہے:

مختصر بیانُ القرآن

ترجمہ مع منتخب حواشی

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

دیدہ زیب ٹائٹل — مضبوط جلد — 1248 صفحات

ڈیلکس ایڈیشن: ~~4500~~ کے بجائے 2200 روپے

سٹینڈرڈ ایڈیشن: ~~2500~~ کے بجائے 1500 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

maktaba@tanzeem.org — 0301-1115348

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

’’اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!‘‘

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ

جلد : 74
شمارہ : 10
ربیع الثانی 1447ھ
اکتوبر 2025ء
فی شمارہ : 50 روپے
سالانہ زرتعاون : 500 روپے

مُدیر مسئول
شجاع الدّین شیخ

مُدیر اعزازی
حافظ عاکف سعید

مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت
○ رضاء الحق ○ ایوب بیگ مرزا
○ خورشید انجم ○ وسیم احمد

معاون مدیران
○ محمد خلیق ○ حافظ محمد زاہد

مکتبہ خُدام القرآن لاہور، 36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700
فون: 3-35869501 (042)، 0341-4941212
ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321
publications@tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی ’’دارالاسلام‘‘ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

ویب سائٹ www.tanzeem.org , www.tanzeemdigitallibrary.com

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

❁ عرضِ احوال ——— 5
ماحولیاتی تباہی یا عالمی سازش؟
رضاء الحق

❁ درسِ قرآن ——— 7
سُوْرَةُ الْبَقَرَة (۲)
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

❁ مطالباتِ دین ——— 23
تکبیرِ ربّ کا حقیقی مفہوم
سورۃ المدثّر کی آیات ۱ تا ۳ کی روشنی میں
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

❁ تذکرہ و تبصرہ ——— 42
اتحادِ اُمّت اور پاکستان کی سالمیت
شجاع الدین شیخ

❁ دعوتِ فکر ——— 45
خود احتسابی: زندہ قوموں کا شعار
حافظ عاکف سعید

❁ ظروف و احوال ——— 61
اسلام، جمہوریت اور پاکستان
ایوب بیگ مرزا

❁ تعمیرِ سیرت ——— 68
تکبّر اور اُس کا علاج
حافظ محمد اسد

❁ حقیقتِ دین ——— 74
اسماء اللہ الحسنیٰ (۴)
پروفیسر حافظ قاسم رضوان

’’ادارہ‘‘ کا مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے کامل اتفاق ضروری نہیں!

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ماحولیاتی تباہی یا عالمی سازش؟

جغرافیائی اور سیاسی اعتبار سے مملکتِ خداداد پاکستان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی طاقتوں کو اس کا وجود کھٹکتا ہے۔ دوسری طرف اس کی جغرافیائی صورتِ حال کچھ ایسی بن چکی ہے کہ پاکستان کی خوبیاں اس کی کمزوریاں بنا دی گئی ہیں۔ سال کے بارہ مہینوں میں سے چھ مہینے عوام کو یہ بتایا جاتا ہے کہ پاکستان میں آبی وسائل کم ہو رہے ہیں اور چھ مہینے یہ بتایا جاتا ہے کہ غیر متوقع بارشوں اور دریاؤں میں سیلاب آجانے سے پاکستان کا بیشتر حصہ ڈوب گیا ہے اور عوام سیلاب سے متاثرہ افراد کی بحالی کے لیے دل کھول کر عطیات جمع کرائیں۔ پاکستانی عوام تو ایک طرف، عالمی ادارے بھی ان مواقع پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ عوام تو اگلے جہاں کے لیے سرمایہ کاری کرتے ہیں کہ اس دنیا میں خرچ کیا ہوا ایک روپیہ اُنہیں اگلے جہاں میں ستر یا سات سو روپے کے برابر ثواب دے گا جبکہ عالمی ادارے تو اسی دنیا میں حساب برابر کرنے کے چکر میں ہوتے ہیں۔ سیلاب زدگان کی امداد کے لیے آنے والے کئی اداروں کے بارے میں ایسی خبریں منظرِ عام پر آچکی ہیں کہ وہ ملکی معاملات میں مداخلت کا ایجنڈا رکھتے ہیں۔

پاکستان ہی نہیں دنیا بھر میں جب بھی کہیں کوئی ناگہانی آفت آتی ہے تو بڑی طاقتیں عموماً امدادی ٹیموں کے لبادے میں اپنی جاسوسی اور اپنے ملک کے لیے سافٹ امیج بنانے والی ٹیمیں بھیج دیتی ہیں۔ تاہم غیور قومیں ایسے کڑے امتحانات کے وقت بھی کسی غیر کی مدد شکریہ کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہیں۔

چند سال پہلے تک تو پاکستان میں صرف دو ہی (خشک سالی اور سیلاب) شیڈولڈ آفات تھیں مگر اب ایک اور شیڈولڈ آفت سموگ کے نام سے آچکی ہے۔ اس کی وجہ سے سرکاری دفاتر جہاں پہلے ہی کام نہیں ہوتا، سرکاری تعلیمی ادارے جہاں تعلیم اور تربیت کے مواقع پہلے ہی محدود ہوتے ہیں وہاں مزید چھٹیاں کر دی جاتی ہیں۔ گزشتہ برس سموگ کے علاج کے لیے چھٹیوں کے

علاوہ مصنوعی بارشوں کا بھی اہتمام کیا گیا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ماحولیاتی تبدیلیوں کا باعث بننے والے ادارے اور ممالک ماحول کو بہتر بنانے کے لیے باتیں تو بہت کرتے ہیں مگر نتیجہ پہلے سے زیادہ آلودگی کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

حقیقت یہ ہے کہ گرین ہاؤس گیسز کو کم کرنا اُن بڑے ممالک اور اداروں کا کام ہے جن کی وجہ سے یہ نقصان دہ ماحول پیدا ہوتا ہے۔ ہماری کسی صنعت کا شمار ان میں نہیں ہوتا مگر پاکستان اور دیگر چھوٹے ممالک کو گرین ہاؤس گیسز سے ہونے والے نقصانات سے محفوظ رہنے کے لیے تیاری کا پابند بنایا گیا ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم بڑے اور صنعتی ممالک کے رعب میں آچکے ہیں اور ان کے حکم پر دولت اور خون پسینہ بہانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اِس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ امریکہ صرف غزہ اور روس کے خلاف جنگ کے حوالے سے اسرائیل اور یوکرین کو ۹۰ ارب ڈالر کا اسلحہ اور گولہ بارود دے چکا ہے۔ اس مناسبت سے امریکہ کو گرین ہاؤس گیسز کو کم کرنے کے لیے بھی خرچ کرنا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔

گزشتہ سال سموگ کے علاج کے لیے بیش قیمت مصنوعی بارش پر جس قدر رقم پاکستان میں خرچ کی گئی، اس سے کئی گنا کم خرچ پر سموگ سے بچاؤ کے لیے اقدامات کیے جاسکتے تھے۔ چونکہ یہ اقدامات کرنے سے بہت سی بڑی دکانداریاں بند ہو جاتیں اس لیے انہی دکانوں سے سموگ کے علاج کی دوائی خرید کر بتایا گیا کہ ہم بہت ماڈرن اور ترقی یافتہ ہیں۔ ترقی یافتہ کیا خاک ہیں کہ ہمیں اپنے نفع اور نقصان کا بھی علم نہیں۔ علماء، دانشور، صحافی، سب کہتے رہے کہ عوام اور حکمران مل کر اللہ کے سامنے گڑگڑا کر معافی مانگیں اور بارانِ رحمت کے لیے دعا کریں مگر تان مصنوعی بارش ہی پر آ کر ٹوٹی۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ جب حکومتیں بدلتی ہیں تو عوام کے لیے بنائے گئے منصوبے بھی تبدیل کر دیے جاتے ہیں۔ ''گرین اینڈ کلین پاکستان'' کا منصوبہ بھی عوام کے لیے تھا تاکہ ہم صاف فضا اور بہتر ہوا میں سانس لے سکیں، مگر متعلقہ حکومت کے ساتھ ہی وہ منصوبہ بھی ختم ہو گیا۔

ہمارے ملک میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے کل اخراج میں گھریلو حصہ بمشکل بیس فیصد ہے جبکہ سب سے بڑا حصہ توانائی کے شعبہ سے منسلک ہے۔ بجلی بنانے کے لیے کوئلے کو جلایا جاتا ہے۔

(باقی صفحہ 44 پر)

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۲)

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

آیت ۱ الٓمّٓ ﴿۱﴾ ’’الف‘ لام‘ میم‘‘

سورۃ البقرۃ کے آغاز میں سب سے پہلے حروفِ مقطعات آ رہے ہیں: الٓمّٓ ۔ انہیں مقطعات کیوں کہا جاتا ہے؟ قَطَعَ یَقْطَعُ قَطْعًا کا معنی ہے کاٹ دینا‘ جدا کرنا‘ جب کہ بابِ تفعیل میں قَطَّعَ یُقَطِّعُ کا معنی ہوگا ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ ان کو حروفِ مقطعات اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان حروف کو علیحدہ علیحدہ پڑھا جاتا ہے۔ لکھنے میں ’’الٓمّٓ‘‘ جڑے ہوئے ہیں لیکن اس کو ’’اَلَمْ‘‘ نہیں‘ بلکہ الف‘ لام‘ میم پڑھا جائے گا۔ حٰمٓ (حا اور میم) دو حروف قرآن میں جڑے ہوئے ملیں گے لیکن حا‘ میم کو علیحدہ پڑھا جائے گا۔ اسی طرح یٰسٓ (یا‘ سین)‘ طٰہٰ (طا‘ ہا)‘ الٓرٰ (الف‘ لام‘ را)‘ کٓہٰیٰعٓصٓ (کاف‘ ہا‘ یا‘ عین‘ صاد)۔ چونکہ انہیں علیحدہ علیحدہ pronounce کیا جاتا ہے اس لیے ان کو حروفِ مقطعات کہا جاتا ہے۔

حروفِ مقطعات: چند اصولی باتیں

حروفِ مقطعات کے بارے میں چند باتیں بالکل قطعی اور متفق علیہ ہیں۔ ان میں سے اوّلین یہ ہے کہ ان کا حتمی اور یقینی مفہوم ومعنی اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ ان کے بارے میں اقوال بہت سے ہیں۔ لوگوں نے بہت سی آراء دی ہیں۔ اپنے اپنے ذوق اور اپنے اپنے مزاج کے مناسبت سے باتیں کہی ہیں۔ البتہ اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ ان الفاظ کا یقینی اور حتمی مفہوم کسی کو معلوم نہیں۔ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مابین ایک راز ہے۔

اسی اعتبار سے بعض حضرات نے کہا کہ یہ ایک طرح سے code words ہیں۔ جیسے کسی اہم پیغام کو آگے بھیجنے (communicate) سے پہلے خفیہ رموز دیے جاتے ہیں‘ تو شاید یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ کو پہلے سے بتلا دیے گئے ہوں اور ان کے حوالے سے کوئی سورت نازل ہوئی ہو تو وہ حروف اس کے ساتھ سند کے درجے میں آئے ہوں۔ واللہ اعلم! بہرحال اس کی حیثیت ایک قیاس (conjecture) کے سوا کچھ نہیں۔

حروفِ مقطعات کے بارے میں دوسری یقینی بات یہ ہے کہ حضور ﷺ سے اس کے معنی ومفہوم کے بارے میں مرفوعاً کوئی بات بیان نہیں ہوئی‘ یعنی حضور ﷺ نے خود ان کے معنی نہیں بتائے۔ اگر یہ آپ ﷺ کی طرف سے منقول ہوتے تو ہم اس پر سرِتسلیم خم کرتے۔ دراصل عربوں کا ایک خاص مزاج تھا جو ہم یہاں سے اخذ (infer) کر سکتے ہیں۔ اُن کا عمل کی طرف زیادہ دھیان تھا‘ زیادہ توجّہ تھی۔ یعنی ان کا مزاج action oriented تھا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ سے اُن چیزوں کے بارے میں جن کا تعلق انسان کے عمل سے نہیں ہے‘ بہت کم سوالات کیے ہیں۔ اس کی نمایاں مثال اس حدیث میں سامنے آتی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: ((اِنَّھَا سَتَکُوْنُ فِتْنَۃٌ)) ’’عنقریب ایک بہت بڑا فتنہ رونما ہوگا۔‘‘ اب حضور ﷺ نے یہ خبر دے دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سوال کیا: مَا الْمَخْرَجُ مِنْھَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ؟ [۶] ’’اے اللہ کے رسول ﷺ! اس سے نکلنے کا راستہ کون سا ہوگا؟‘‘ یہیں سے فرق نمایاں ہو جاتا ہے کہ اگر ہم ہوتے تو پوچھتے وہ فتنہ کب ہوگا! کیوں ہوگا؟ کدھر سے آئے گا؟ کیسے آئے گا؟ کس صورت میں آئے گا؟ یہ سارے سوالات علمی ومعلوماتی نوعیت کے ہیں۔ حضرت علیؓ نے ’’کب‘ کیوں‘ کیسے‘ کدھر سے‘‘ نہیں پوچھا‘ بلکہ وہ سوال کیا جس کا تعلق عمل سے ہے کہ اُس فتنہ سے نجات کی راہ کون سی ہوگی! اس سے نکلنے کا راستہ کیا ہوگا! اس کے جواب میں حضور ﷺ نے جو ارشادات فرمائے وہ قرآن مجید کی مدح وتعریف اور عظمت کے اعتبار سے فصاحت وبلاغت کا‘ حکمت کا‘ علم ومعرفت کا بہت بڑا خزانہ ہیں۔

حروفِ مقطعات کے بارے میں تیسری بات یہ ہے کہ صحابہؓ نے پوچھا نہیں کہ یہ الفاظ کیا ہیں‘ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً یہ کوئی معروف اسلوب تھا‘ ورنہ کوئی نہ کوئی تو سوال کرتا۔ صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کے احترام اور تعظیم میں سوال نہ بھی کرتے‘ کیونکہ یہ عمل سے متعلق نہیں تھا‘ لیکن معترضین تو اعتراض کرتے کہ یہ کیا! الٓمّٓ‘ حٰمٓ‘ کٓھٰیٰعٓصٓ ان کے کیا معنی ہیں؟ ان کا کوئی مفہوم سمجھ نہیں آیا‘ جبکہ قرآن تو کتابِ مبین ہونے کا دعویٰ کرتا ہے کہ میں بالکل روشن اور واضح کتاب ہوں‘ میرے مضامین بالکل واضح ہیں۔ یہ بات ثابت ہے کہ کسی نے اعتراض یا سوال نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے ہاں یہ اسلوب معروف تھا۔ شاید ان کے ہاں خطیب خطبہ دینے سے پہلے کوئی معروف حروف بول کر خطبہ شروع کرتا ہو۔ کوئی مناسبت بھی ہوسکتی ہے۔ لوگوں نے اپنے ذہن کی رسائی اور فکر کی جولانی کے اعتبار سے مناسبتیں قائم کی ہیں تو ہوسکتا ہے اس زمانے میں یہ ایک معروف اسلوب ہوتا ہو اور اسی وجہ سے کُفّار و مشرکین نے‘ معاندین اور دشمنوں نے کوئی اعتراض نہیں اُٹھایا۔ حالانکہ کافروں نے قرآن پر بعض اعتراضات کیے تھے۔ مثلاً یہ کیا کہ قرآن مجید میں مچھر جیسی حقیر شے کی تشبیہ دی جا رہی ہے۔ کہیں مکڑی کی تشبیہ دی جا رہی ہے! اس کا جواب دیا گیا کہ تشبیہ کا حسن تو اس میں ہوتا ہے کہ جس چیز کے لیے تشبیہ دی جا رہی ہے اس کے ساتھ کمال مناسبت ہو۔ کسی حقیر شے کی تشبیہ دینی ہو تو وہ حقیر شے سے ہی دی جائے گی تاکہ اس کا حقیر ہونا پوری طرح سے مبرہن ہو جائے۔ بہرحال حروفِ مقطعات کے استعمال پر اور ان کے قرآن مجید میں بطور وحی شامل ہونے پر کوئی اعتراض منقول نہیں ہے۔

مذکورہ بالا تینوں چیزیں تو متفق علیہ ہیں۔ باقی اس کے مفاہیم کے بارے میں جو آراء ظاہر کی گئی ہیں ان کے بیان سے پہلے ان کے بارے میں کچھ اعداد و شمار (statistics) ہیں جو کہ دلچسپی کے حامل ہیں۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان اعداد و شمار کے حوالے سے ان کے معانی و مفاہیم پر کوئی روشنی پڑتی ہے‘ لیکن یہ اگر سامنے ہوں تو ہوسکتا ہے کہ حروفِ مقطعات بھی ان چیزوں میں سے ہوں جن کے حقائق شاید آئندہ چل کر روشن ہو جائیں۔ جیسا کہ اس آیت مبارکہ (حٰمٓ السجدۃ:۵۳) میں ارشاد ہوا:

﴿سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ﴾

’’عنقریب ہم انہیں دکھائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور ان کے اپنے نفس میں بھی‘ یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔‘‘

تو ہوسکتا ہے ان حروفِ مقطعات کے حوالے سے بھی کوئی حقیقت بعد میں ایسی سامنے آ جائے جس سے قرآن مجید کی حقانیت مزید واضح اور مبرہن ہو جائے۔ اس کا امکان موجود ہے۔ تاہم یہ امکان اسی شکل میں ہے کہ اس کے اعداد و شمار کا data سامنے رہے تاکہ غور کرنے والے غور کرتے رہیں۔

یہ حروفِ مقطعات حروفِ ہجاء (alphabets) سے مرکب ہیں یعنی الف، با، تا، ثا..... یاء تک۔ عربی زبان کے حروفِ ہجاء کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا ان کی تعداد ۲۸ ہے یا ۲۹۔ یہ دونوں عدد مانے جاتے ہیں۔[۷]

۲۸ کے اعتبار سے حروفِ ہجاء کی پوری تختی کو تین حصوں میں تقسیم کر لیں تو درمیان میں ۶ جوڑے ہیں‘ جن میں سے ہر جوڑے میں ایک حرف نقطے والا اور ایک بغیر نقطے کے ہے: د ذ ، ر ز ، س ش ، ص ض ، ط ظ ، ع غ ۔ ان میں د ذ کو علیحدہ کر دیں تو ’’ر‘‘ سے ’’غ‘‘ تک یہ ۵ جوڑوں پر مشتمل ۱۰ حروف کی درمیانی تختی ہے۔ ان میں سے نقطے والا حرف حروفِ مقطعات میں نہیں لیا گیا‘ بغیر نقطے کا لیا گیا ہے۔ یعنی ’’ر‘‘ ہے ’’ز‘‘ نہیں ہے۔ اسی طرح ’’س‘‘ ہے ’’ش‘‘ نہیں ہے۔ ’’ص‘‘ ہے ’’ض‘‘ نہیں ہے۔ ’’ط‘‘ ہے ’’ظ‘‘ نہیں ہے اور ’’ع‘‘ ہے ’’غ‘‘ نہیں ہے۔ یوں پانچ جوڑوں میں سے جو حروف نقطوں کے بغیر ہیں وہ حروفِ مقطعات میں شامل ہیں اور جو نقطے والے ہیں وہ حروفِ مقطعات میں شامل نہیں ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ ہمیں نہیں معلوم۔ بس ایک مشاہدے (observation) کی حد تک بات بیان کر دی گئی ہے۔ اس کے حوالے سے غور کیا جائے تو شاید کوئی حقیقت کھل جائے گی۔ واللہ اعلم!

ابتدا کے ۹ حروف (ا،ب،ت،ث،ج،ح،خ،د،ذ) میں سے صرف دو حرف لیے گئے ہیں: الف اور ح جبکہ باقی سات حروفِ مقطعات میں شامل نہیں ہیں۔ آخری ۹ حروف

(ف،ق،ک،ل،م ،ن،و،ھ،ی) میں سے سات حروفِ مقطعات میں شامل ہیں‘ دو نہیں ہیں۔ یعنی ق، ک، ل، م، ن، ھ، ی شامل ہیں جب کہ ’’ف‘‘ اور ’’و‘‘ شامل نہیں ہیں۔ گویا حروف تہجی کے پہلے ۹ میں سے ۲‘ آخری ۹ میں سے ۷ اور درمیان سے ۵ (جو نقطے کے بغیر ہیں) حروفِ مقطعات میں شامل ہیں۔ اس طرح حروفِ تہجی کے ۲۸ حروف میں سے نصف یعنی ۱۴ حروف مقطعات کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔

ایک اور مشاہدہ جس کو اتفاق (co-incidence) تو نہیں کہہ سکتے چونکہ قرآن مجید کا معاملہ ہے‘ یقیناً کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوگی جو آنے والے وقتوں میں اللہ تعالیٰ اس کے قاریوں پر منکشف کر دیں گے کہ ۱۱۴ سورتوں میں سے ۲۹ کے آغاز میں حروفِ مقطعات آئے ہیں۔

ان ۱۴ حروف میں سے ۳ سورتوں میں ایک ایک حرف آیا: نٓ، قٓ اور صٓ۔

۹ سورتوں میں دو دو حروف آئے ہیں۔ ان میں سے ۶ میں حٰمٓ، جبکہ تین میں طٰہٰ، طٰسٓ، یٰسٓ۔

۱۳ سورتیں وہ ہیں جن میں تین تین حروف آئے ہیں۔ الٓمٓ: ۶ میں‘ الٓرٰ: ۵ میں‘ طٰسٓمٓ: ۲ میں۔

۲ سورتیں وہ ہیں جن میں چار چار حروف آئے ہیں: الٓمٓصٓ، الٓمٓرٰ۔

۲ سورتیں وہ ہیں جن میں پانچ پانچ حروف آئے ہیں: کٓہٰیٰعٓصٓ اور حٰمٓ عٓسٓقٓ[8]۔

حٰمٓ دو حروف ہیں لیکن آیت شمار ہوتے ہیں‘ الٓرٰ تین حروف ہیں لیکن آیت شمار نہیں ہوتے۔ یہ تمام امور توقیفی ہیں جو حضورﷺ نے بتائے ہیں۔ سورۃ الشوریٰ قرآن کریم کی واحد سورت ہے جس کی دو آیات حروفِ مقطعات پر مشتمل ہیں: حٰمٓ ایک آیت‘ عٓسٓقٓ دوسری آیت۔

حروفِ مقطعات: چند آراء

(۱) حروفِ مقطعات کے بارے میں بعض حضرات کی یہ رائے کہ یہ حروف سورتوں کے نام ہیں‘ جزوی طور پر صحیح ہے۔ سورۃ القلم کو ہم سورۂ نون بھی کہتے ہیں۔ اس کا آغاز ہوتا

ہے: ﴿نٓ وَالۡقَلَمِ وَمَا يَسۡطُرُوۡنَ ۝۱﴾ ’’ن‘ قسم ہے قلم کی اور جو کچھ یہ لکھتے ہیں‘‘۔

حرفِ ’’ق‘‘ سے شروع ہونے والی سورت کو سورۂ قٓ کہتے ہیں‘ اس کا کوئی دوسرا نام نہیں ہے۔ اسی طرح یٰسٓ، طٰہٰ اور صٓ سے شروع ہونے والی سورتوں کے نام یہی ہیں‘ ان کے کوئی دوسرے نام نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے یہ رائے کہ حروفِ مقطعات سورتوں کے نام ہیں‘ جزوی طور پر تو صحیح ہے‘ کُلّی طور پر صحیح نہیں۔ اس لیے کہ تمام سورتوں میں تو حروفِ مقطعات نہیں آئے۔ دوسرے یہ کہ الٓمٓ چھ سورتوں کے شروع میں آرہا ہے‘ تو چھ سورتوں کا ایک ہی نام الٓمٓ تو نہیں ہوسکتا۔ سورۃ السجدۃ کو الٓمٓ السجدۃ بھی کہہ دیتے ہیں حٰمٓ السجدہ سے علیحدہ کرنے کے لیے۔ مولانا اصلاحی صاحب کو اس پر بہت اصرار ہے کہ یہ نام ہی ہیں۔ انہوں نے ’’الٓمٓ‘‘ کو مستقل جملہ قرار دیا ہے اور اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: ’’یہ الف‘ لام‘ میم ہے‘‘۔ گویا ’’الٓمٓ‘‘ سے پہلے مبتدأ (ھٰذا) کو محذوف مانا ہے: ھٰذَا الٓمٓ ۔ یہ بات جزوی طور پر تو صحیح ہے لیکن اس کو بطور قاعدہ کلیہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) ایک رائے مولانا اصلاحی صاحب کے استاد مولانا حمید الدین فراہیؒ کی ہے جو کہ بڑی دلچسپ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عربی زبان کے حروف عبرانی سے لیے گئے ہیں اور عبرانی کے یہ حروف اُن حروف سے ماخوذ ہیں جو عرب قدیم میں رائج تھے۔ یہ حروف چینی زبان کے حروف کی طرح معانی اور اشیاء پر بھی دلیل ہوتے تھے اور عموماً انہی کی صورت و ہیئت پر لکھے بھی جاتے تھے۔ مولانا فراہیؒ کی تحقیق کے مطابق بعض حروف کے معنیٰ اب بھی معلوم ہیں اور ان کے لکھنے کے ڈھنگ میں بھی ان کی قدیم شکل کی کچھ نہ کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔ مثلاً ’’الف‘‘ گائے کے معنی بتاتا تھا اور گائے کے سر کی صورت ہی پر لکھا جاتا تھا۔ ’’ب‘‘ کو عبرانی میں بیت کہتے ہیں اور اس کے معنی بھی ’’بیت‘‘ (گھر) کے ہیں۔ آپ تصور کیجیے گھر کا کیا نقشہ ہوتا تھا۔ جب تک انسان کو چھت ڈالنی نہیں آتی تھی تو گھر صرف چار دیواری کی شکل میں ہوتا تھا۔ ’’ب‘‘ دراصل represent کرتا ہے بیت یعنی گھر کو۔ اسی طرح ’’ج‘‘ ایسے لکھتے تھے جیسے اونٹ کا سر اور گردن کا خم ہوتا ہے۔ عبرانی میں ’’ج‘‘ کا تلفظ جیمل ہے جبکہ عربی میں جمل اونٹ کو کہتے ہیں۔

اسی طریقے سے ''ن'' کا حرف مچھلی کے مانند لکھا جاتا تھا۔ مصور علامتی طور پر مچھلی کی تصویر کشی ایسے کرتے ہیں کہ ایک قوس نما (curved) خط ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک نقطہ اگر اوپر کر کے درمیان میں ڈال دیا تو یہ چاند تارے کو ظاہر کرے گا اور ایک طرف نقطہ ڈالا ہے تو وہ نقطہ آنکھ کو ظاہر کرے گا اور یہ مچھلی کی صورت بن جائے گی۔ ''نون'' کا لفظ مچھلی کے معنی میں قرآن میں بھی آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا﴾ (الانبیاء:۸۷) ''اور مچھلی والا جب وہ حالت غصہ میں چل دیا۔'' مراد ہیں حضرت یونس علیہ السلام جن کو اللہ کے حکم سے مچھلی نے نگل لیا تھا اور وہ مچھلی کے پیٹ میں رہے ہیں ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کے قیدی۔ پھر اللہ کے حکم سے مچھلی نے انہیں اُگلا ہے۔ قرآن میں انہیں صَاحِبِ الْحُوْتِ (مچھلی والے) بھی کہا گیا ہے۔ سورۃ ''ن'' کے آخر میں فرمایا:

﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَ هُوَ مَكْظُوْمٌ ۝۴۸﴾ (القلم)

تو (اے نبی ﷺ!) آپ انتظار کیجیے اپنے رب کے حکم کا اور دیکھیے' آپ اُس مچھلی والے کی طرح نہ ہو جایئے گا' جب اُس نے پکارا (اپنے ربّ کو) اور وہ اپنے غم کو اندر ہی اندر پی رہا تھا۔''

جبکہ سورت شروع ہو رہی ہے ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝۱﴾ کے الفاظ سے۔ گویا کہ مناسبت قائم ہے۔ اخیر میں ''ذُو النُّوْنِ'' کا ذکر ہو رہا ہے اور حرف ''ن'' سے ہی سورت شروع ہوئی ہے۔

اسی طرح عبرانی زبان میں حرفِ ''ط'' کے معنی سانپ کے تھے اور اس کے لکھنے کی ہیئت بھی سانپ کی ہیئت سے ملتی جلتی تھی۔ حرف ''ط'' اب بھی سانپ کی مانند لکھا جاتا ہے' جیسے کوبرا نے پھن اٹھایا ہوا ہو تو اس کے دھڑ کا حصہ اٹھا ہوا ہے' اُوپر پھن ہے اور نیچے کنڈلی ہے۔ تو ط ایک طریقے سے سانپ کو represent کرتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو جن سورتوں میں خاص طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات زیرِ بحث آئے ہیں ان کے شروع میں جو حروف مقطعات آئے ہیں وہ ط کے ساتھ آئے ہیں۔ سورۃ طٰہٰ

کے تقریباً پانچ رکوع حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات پر ہیں۔ آپؑ کا سب سے بڑا معجزہ یہی تھا کہ آپؑ کا عصا سانپ کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ اسی طرح طٰسٓ' طٰسٓمّٓ سے شروع ہونے والی سورتوں میں بھی اسی معجزہ کا تذکرہ ہے' چنانچہ اس کے اندر بھی ایک مناسبت نظر آ رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میم پانی کی لہر کو ظاہر کرتی ہے۔ عام طور پر عربی زبان کی بڑی میم ایسے لکھتے ہیں کہ ایک طرف کنڈی سی ہے اور دوسری طرف اس کا بازو تقریباً افقی (horizontal) ہو جاتا ہے۔ یہ سمندر کی لہر کی مانند ہے۔ چنانچہ وہ سورتیں کہ جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے سمندر کے پھٹ جانے کا تذکرہ پایا جاتا ہے اُن سورتوں کے شروع میں حرف میم آیا ہے: الٓمّٓ، طٰسٓمّٓ۔ یہ بھی ایک درجے میں دلچسپی کی بات ہے۔ بعض حروفِ مقطعات میں سورت کے مضمون کے ساتھ ایک مناسبت کسی درجے میں یقیناً نظر آ رہی ہے' البتہ اس کی حیثیت ایک نظریہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس بنیاد پر مضامین قرآن کی وضاحت نہیں کی جا سکتی اور اس سے کوئی قاعدہ کلیہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) اس ضمن میں ایک بات مزید عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حال ہی میں ۱۹ کے عدد کے حوالے سے ایک شخص ڈاکٹر رشاد خلیفہ کے نظریہ کو بہت شہرت ملی ہے۔ یہ شخص امریکہ میں ہوتا تھا' اور مرتد ہو کر فوت ہوا ہے۔ اس کی زندگی میں لوگوں کو دھوکا ہوا اور اسے مسلمان سمجھتے رہے جب کہ وہ شخص بہائی تھا۔ اس نے ۱۹ کے ہندسے کو قرآن کے سائنسی ثبوت کے طور پر پیش کیا کہ قرآن مجید کا ایک ریاضیاتی (Mathematical) نظام ہے اور کمپیوٹر نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس طرح کی چیزیں عام مسلمانوں کی دلچسپی کی ہوتی ہیں' لہٰذا اس کی بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔ نیک دل لوگوں نے اس کی یہ ''تحقیق'' چھپوا چھپوا کر تقسیم کی۔ حالانکہ قرآن مجید کی حقانیت کے لیے اس طرح کے ثبوت کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں۔ چونکہ رشاد خلیفہ کی بات ایک اعتبار سے جزوی طور پر صحیح ہے' لہٰذا اس کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

اس کا کہنا ہے کہ جو حروفِ مقطعات کسی سورت کے شروع میں آئے ہیں وہ حروف اس سورت میں ۱۹ کے حاصل ضرب (multiple) کی شکل میں آئے ہیں۔ یہ قرآن کا

ایک ریاضیاتی سسٹم ہے۔ اس کی بدبختی یہ ہوئی کہ اس نے اس اصول کو ایسا قطعی قرار دے دیا کہ جہاں یہ منطبق نہیں ہوا‘ اس نے کہا کہ درحقیقت قرآن کی یہ سورت ہی غلط ہے‘ اس میں ان دو آیتوں کا اضافہ بعد میں کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی غیر محفوظیت کی بات کرنے کے بعد اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا‘ پھر کسی شخص نے اس کو قتل کر دیا۔ یہ رشاد خلیفہ کا حشر ہو چکا ہے۔ اُس نے ’’ریاضیاتی سسٹم‘‘ کی آڑ میں قرآن مجید پر شدید حملہ کیا تھا۔ پہلے ۱۹ کے عدد کے حوالے سے سستی شہرت حاصل کی‘ پھر اپنی نبوت کی دکان چمکائی اور قرآن مجید کے غیر محفوظ ہونے کا دعویٰ لے کر کھڑا ہو گیا۔ بہرحال وہ تو دنیاوی لحاظ سے کیفرِ کردار تک پہنچ چکا ہے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ جو بھی معاملہ کرے‘ تاہم علمی طور پر اس کی بات جزوی طور پر صحیح ہے۔ خاص طور پر سورۂ قٓ کے حوالے سے‘ جو شروع ہوتی ہے: ﴿قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ①﴾ سے۔ اس سورت میں حرف ق ۵۷ مرتبہ آیا ہے۔ بہت سے حضرات نے تحقیق کر کے ثابت کیا ہے کہ اس نے جھوٹ بھی بولا ہے‘ غلط اعداد وشمار بھی دیے ہیں۔ تاہم سورۂ قٓ کے معاملے میں مجھے اس کی بات کافی وزنی نظر آئی کہ اس سورت میں لفظ ق ۵۷ مرتبہ آیا ہے اور ایک جگہ پر ’’قومِ لوط‘‘ کی بجائے ’’اِخْوَانُ لُوْطٍ‘‘ کا لفظ آیا ہے جبکہ پورے قرآن میں جہاں بھی حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر آیا کہیں بھی ’’اخوان لوط‘‘ نہیں آیا‘ قومِ لوط ہی آیا ہے۔ سورۃ قٓ میں اگر ’’اخوان لوط‘‘ کی جگہ ’’قومِ لوط‘‘ آ جاتا تو حرف ق ۵۸ مرتبہ ہو جاتا اور یہ ۱۹ کا حاصل ضرب نہ رہتا۔ اس اعتبار سے یہ بات بعض مقامات پر جزوی حقیقت ہو سکتی ہے۔

اس نے بعض جگہوں پر قرآن مجید سے استشہاد بھی کیا تھا۔ ۱۹ کے عدد کے حوالے سے اُس نے سورۃ المدثر کی اس آیت کو بنیاد بنایا تھا: ﴿عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ㉚﴾ یعنی جہنم پر جو نگران فرشتے ہیں‘ پہرے دار ہیں وہ ۱۹ کی تعداد میں ہیں۔ اس نے کہا کہ ۱۹ کا ہندسہ قرآن مجید کے الفاظ کی بھی حفاظت کر رہا ہے۔ اس اعتبار سے اس نے آیت بسم اللہ سے بات شروع کی کہ اس کے ۱۹ حروف ہیں۔ حالانکہ اس کی یہ پہلی بات ہی غلط ہے۔ آیت بسم اللہ کے حروف ۱۹ نہیں بنتے‘ لہٰذا میں نے اس کی بات کو زیادہ سنجیدہ نہیں لیا۔

آج کی دنیا کی ایک بہت معروف شخصیت شیخ احمد دیدات (۱۹۱۸ء۔۲۰۰۵ء) ہیں جو عیسائیت کی تردید میں کامیاب مناظرے کر چکے ہیں۔ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیابیاں دی ہیں اور وہ دُنیا بالخصوص عالَمِ اسلام میں بہت مشہور ہوئے ہیں۔ وہ بھی رشاد خلیفہ سے بہت زیادہ متاثر ہو گئے تھے اور انہوں نے اُس کے اس خیال کو بہت پھیلایا ہے۔ بعد میں شیخ احمد دیدات نے رجوع کیا‘ توبہ کی اور اس شخص سے اعلانِ لاتعلقی کیا۔ میں نے بہرحال یہ تو سمجھا تھا کہ یہ بھی کوئی جزوی حقیقت ہے جس کے کہیں چل کر ڈانڈے مل جائیں گے‘ باقی اس سے زیادہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

(۴) حروفِ مقطعات کے بارے میں آخری بات مَیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے حوالے سے کہنا چاہ رہا ہوں‘ اگرچہ اُسے بھی اُمّت میں قبول حاصل نہیں ہوا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حِبر الاُمّۃ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا علمِ تفسیر میں بڑا اونچا مقام ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے ان کے لیے خاص دعا فرمائی تھی: ((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ))[9] ’’اے اللہ! اس (نوجوان) کو دین کا فہم عطا فرما اور قرآن کی تاویل کا علم عطا فرما۔‘‘ اکثر تفسیری روایات حضرت ابن عباس ؓ ہی سے چلتی ہیں۔ ان کے اہم اور مشہور شاگردوں میں عکرمہ‘ مجاہد‘ قتادہ‘ عطاء بن ابی رباح‘ سعید بن جبیر اور حسن بصری (رحمہم اللہ) شامل ہیں۔ ابن عباس ؓ سے ایک رائے منقول ہے کہ حروفِ مقطعات جملوں کی مخفف صورت ہیں۔ مثلاً الٓمّٓ سے مراد ہے ’’اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ‘‘ (میں اللہ ہی سب کچھ جاننے والا ہوں)۔ گویا پہلے لفظ ’’اَنَا‘‘ کا پہلا حرف الف (حالانکہ یہاں ہمزہ ہے‘ الف نہیں) دوسرے لفظ ’’اللّٰہ‘‘ کا درمیانی حرف لام‘ اور تیسرے لفظ ’’اَعْلَمُ‘‘ کا آخری حرف میم مل کر ’’الٓمّٓ‘‘ بنتے ہیں۔ اسی طرح الٓرٰ سے مراد ہے ’’اَنَا اللّٰهُ اَرٰی‘‘۔ یہ ان کا اپنا ایک خیال ہے جس کو ہمارے مفسرین نے قبول نہیں کیا۔ اگر تو یہ حضور ﷺ سے منقول ہوتا تو سرِتسلیم خم تھا لیکن یہ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کا ذاتی خیال ہے‘ لہٰذا مفسرین نے علمی دلچسپی کے انداز میں اس کا صرف ذکر کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُمّت کے اندر یہ ایک اچھا رجحان ہے کہ جہاں تک حضور ﷺ کا فرمان ہے اس پر

چون و چرا نہ ہو' جب ثابت ہو جائے کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ باقی جس کا بھی قول ہو اُسے دلیل سے قبول کریں یا دلیل نہ ہونے کی صورت میں ردّ کر دیں۔

آیت ۲ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲

سورۃ البقرۃ کی دوسری آیت میں ''معانقہ'' ہے۔ قرآن مجید کے بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں کسی ایک لفظ یا ایک ترکیب یا ایک ٹکڑے سے پہلے تین نقطے (ۛ) بنے ہوتے ہیں اور اس کے بعد بھی تین نقطے (ۛ) ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس حصے کو دو طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔ آیت کے سابق حصے سے ملا کر پڑھیے تب بھی صحیح ہے' اور جو اُس کے بعد میں آنے والا حصہ ہے اس کے ساتھ ملا کر پڑھیے تب بھی صحیح ہے۔ چنانچہ اس آیت کو دو طرح سے پڑھ سکتے ہیں:

(۱) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

''یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ یہ ہدایت ہے متقیوں کے لیے۔''

یعنی خدا ترس لوگوں کے لیے' ان لوگوں کے لیے جو نافرمانی سے بچنا چاہیں۔

(۲) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۚ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

''بلاشک وشبہ یہ وہ کتاب ہے۔ اس میں ہدایت ہے متقیوں کے لیے۔''

فِيْهِ سے قبل بھی اور فِيْهِ کے بعد بھی یہ جو نقطے لگے ہوئے ہیں یہ معانقہ کی علامت ہیں۔

اس آیہ مبارکہ میں کچھ نحوی اشکالات ہیں' اگرچہ ترجمہ اور معانی ومفہوم کے ضمن میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ معانقہ کی وجہ سے وقف کے اعتبار سے جو دو امکانات پیدا ہوئے' ترجمے میں اس سے یہ فرق واقع ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس آیت مبارکہ میں قرآن حکیم کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اہلِ نحو کے نزدیک ''ھٰذَا'' اشارۂ قریب کے لیے آتا ہے اور ''ذٰلِكَ'' اشارۂ بعید کے لیے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب ہم قرآن پڑھتے ہیں تو مصحف ہمارے سامنے ہوتا ہے اور ذٰلِكَ کہا جاتا ہے۔ سامنے رکھی ہوئی کتاب کو پڑھتے ہوئے جب ہم ''ذٰلِكَ'' (اشارۂ بعید) کا لفظ پڑھتے ہیں تو ذہن میں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کو سمجھ لیں کہ اشارۂ بعید اور

قریب کے استعمالات اور اس سے معنی اور بیان کے فرق کے بارے میں جو مختلف آراء وجود میں آتی ہیں اُن میں یہ بھی ہے کہ اگر کسی شے کا تذکرہ دورانِ گفتگو پہلے کیا جا چکا ہو یا کوئی شے ایسی ہو کہ جس کا ذہن میں تصور موجود ہو تو اس کی طرف اشارہ ''ذٰلِكَ'' سے کریں گے۔ دوسرے یہ کہ بسا اوقات کسی چیز کی تعظیم کے لیے بھی اشارہ قریب کو مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ ''یہ'' میں تعظیم کا پہلو نہیں جبکہ ''وہ'' میں تعظیم کا پہلو ہے۔ یہ دونوں مفہوم سامنے رہیں تو یہاں ذٰلِكَ کا استعمال بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسم اشارہ ''وہ'' تعظیم کے مفہوم میں ہمارے ہاں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ''ایں'' کے مقابلے میں ''آں'' اشارۂ بعید ہے۔ ایں: یہ' ھٰذَا' اشارہ قریب ہے۔ آں: وہ' ذٰلِكَ' اشارہ بعید ہے۔ ہماری قدیم ادبی (literary) زبان میں جب خطوط لکھے جاتے تھے تو مخاطب کو ''آں محترم'' لکھتے تھے۔ یوں نہیں لکھتے تھے کہ ''میں آپ سے یہ گزارش کرتا ہوں'' بلکہ ''آں محترم سے' آنجناب سے یہ گزارش ہے۔'' تو یہ الفاظ بھی درحقیقت اُسی تعظیم کے مفہوم میں آتے ہیں جس مفہوم میں یہاں ذٰلِكَ کا لفظ آیا ہے۔

فرمایا: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ ''یہ وہ کتاب ہے۔'' یہاں اَلْكِتٰبُ پر الف لام لگا ہوا ہے' اس سے یہ معرفہ بن گیا۔ ''ال'' کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ یا تو وہ لامِ استغراق ہوتا ہے یعنی تمام چیزوں کا احاطہ کرنے والا' یا لامِ جنس۔ لیکن یہ وہ نہیں ہے۔ یہ لامِ عہد ہے۔ گویا کسی کتاب کا تصور ذہن میں موجود ہے۔ اس اعتبار سے بجا طور پر یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ''یہ وہ کتاب ہے'' یا ''یہ کتابِ موعود ہے۔'' (موعود: وعدہ کیا گیا' وہ شے جس کا اقرار کیا گیا ہے۔) ''یہ وہ کتاب ہے۔'' اس میں اشارہ ہو جائے گا کہ جس کی تم نے درخواست کی' تم نے جو سوال کیا یہ اُس سوال کا جواب ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس کا ذکر پہلی آسمانی کتابوں میں موجود ہے۔ تورات کی ''کتاب استثناء'' میں اس کے بارے میں پیشین گوئی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''میں اُن (یعنی بنی اسرائیل) کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم

دوں گا وہی وہ اُن سے کہے گا۔‘‘

بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسماعیل ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے یہ قریش کی نسل ہے‘ جن میں حضور ﷺ کی بعثت ہوئی‘ جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے (حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے) حضرت یعقوب علیہ السلام سے آپ کی نسل کی جو دوسری شاخ چلی وہ بنی اسرائیل کہلاتے ہیں۔

مذکورہ بالا پیشین گوئی درحقیقت قرآن مجید کے بارے میں ہے۔ تو گویا یہاں اشارہ ہو رہا ہے: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ ’’یہ وہ کتاب ہے۔‘‘ یہ کتابِ موعود ہے‘ یا یہ وہ کتابِ ہدایت ہے جس کی تم نے درخواست کی: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ تو ’’ال‘‘ کے اضافے سے یہ اضافی معنی پیدا ہو گئے۔

﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ ’’اس میں کوئی شک نہیں‘‘۔ لَا رَيْبَ فِيْهِ کے دو مفہوم لیے گئے ہیں۔ ایک تو اس کتاب میں کوئی شک نہیں‘ یعنی اس قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں کہ جو شک وشبہ کے قابل ہو۔ یہ کتاب کُل کی کُل یقینی ہے‘ یقینی امور پر مشتمل ہے۔ یہ دعویٰ بہت بڑا ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہو جس کا آغاز اس دعوے کے ساتھ ہو رہا ہو۔ یہ تو دنیا نے مانا ہے اور اس پہلو سے کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ یہ وہی کتاب ہے کہ جو محمدِ عربی ﷺ نے اپنی اُمت کو عطا کی۔ جو لوگ قرآن کریم کو اللہ کا کلام نہیں مانتے وہ بھی یہ مانتے ہیں کہ اس کا متن (text) بالکل خالص (pure) ہے‘ اس میں کہیں تحریف نہیں ہوئی‘ کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بعینہٖ اور بجنسہٖ یہ وہی کتاب ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی اُمت کو عطا کی تھی۔ جو لوگ نبی اکرم ﷺ کی نبوت کو نہیں مانتے وہ بھی یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ یہ کتاب محفوظ ہے۔ اس اعتبار سے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ وہی کتاب ہے جو حضور ﷺ نے اپنی اُمت کو عطا کی۔ ہمارا تو اس پر ایمان اور یقین ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے بندے محمد ﷺ پر نازل فرمائی اور آپ ﷺ نے اُمت کو عطا کی۔

اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اس کے کتاب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔

بعض مفسرین نے تو اس پر تفصیل سے کلام کیا ہے کہ یہی زیادہ موزوں ہے۔ لَا رَيْبَ فِيْهِ ’’اس میں کوئی شے قابلِ شک نہیں‘‘۔ اس میں جو امور بیان ہوئے ہیں وہ سب یقینی ہیں۔ اس میں جو خبریں دی گئی ہیں وہ سب یقینی ہیں۔ اس میں جو پیشین گوئیاں ہیں وہ سب یقینی ہیں۔ اس میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں وہ سب یقینی ہیں۔ اس میں جو اوامر و نواہی (جن امور کا حکم دیا گیا اور جن سے منع کیا گیا) ہیں وہ بھی عقلِ محکم کی بنیاد پر ہیں‘ پختہ ہیں‘ محکم ہیں‘ یقینی ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو یہ کہ یہ کتاب اللہ ہے‘ اس کے کتاب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس طرح سے یہ گویا ایک ہی بیان (statement) بن جائے گا۔ ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ ’’یہ وہ کتاب ہے جس کے کتابِ موعود ہونے میں کوئی شک نہیں۔‘‘ یا ’’یہ وہ کتاب ہے جس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔‘‘

اس آیت کی ترکیب نحوی پر غور کریں۔ ایک رائے تو یہ ہے کہ ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ﴾ میں ذٰلِكَ مبتدأ ہے‘ الْكِتٰبُ خبر اوّل‘ لَا رَيْبَ فِيْهِ اس کی خبر دوم اور هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اس کی خبر سوم ہے۔ گویا تین خبریں ہیں اور مبتدأ صرف ذٰلِكَ ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ ’’ذٰلِكَ الْكِتٰبُ‘‘ اشارہ مشار الیہ مل کر مبتدأ ہے اور باقی لَا رَيْبَ فِيْهِ خبر اوّل‘ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ خبر دوم ہے۔ ایک اور رائے بھی ہے کہ اس سے پہلے مبتدأ محذوف ہے: (هٰذا) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ ’’یہ ہے وہ کتاب‘‘ اور اس کے بعد بدل کے طور پر یا صفت کے طور پر لَا رَيْبَ فِيْهِ آیا ہے۔ یہ ہے وہ کتاب جس میں کوئی شک نہیں۔ اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ ’’یہ (قرآن) ہدایت (رہنمائی) ہے متقین کے لیے۔‘‘ سورۃ الفاتحہ میں ہدایت کی درخواست کرتے ہوئے الفاظ آ چکے ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ ’’ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔‘‘ سورۃ الفاتحہ کے ضمن میں تفصیلاً عرض کیا جا چکا ہے کہ ایک سلیم العقل اور سلیم الفطرت انسان ایمان کے بنیادی حقائق تک تو خود پہنچ جاتا ہے‘ البتہ اُس میں یقین کی گہرائی کی ضرورت ہوتی ہے جو انبیاء اور رسولوں کے بغیر ممکن نہیں۔ اس خاکے میں تفصیلات کا رنگ انبیاء ورسل علیہم السلام کی تعلیمات ہی

کے ذریعے سے بھرا جا سکتا ہے۔ بنیادی طور پر جو ایمان کے حقائق ہیں‘ یعنی اللہ کی توحید کہ وہ خالق و مالک ہے‘ تنہا ہے‘ تمام صفاتِ کمال اُس کی ذات میں بہ تمام و کمال موجود ہیں‘ وہ حمید ہے‘ غنی ہے‘ سبوح ہے‘ قدوس ہے‘ اور یہ کہ انسانی اعمال ضائع ہونے والی چیز نہیں ہیں‘ مکافاتِ عمل‘ مجازات کا ظہور ہو کر رہے گا۔ یہ حضرت لقمانؑ کے نصائح میں بھی بیان ہوئے۔ گویا یہ چیزیں تو وہ ہیں کہ ایک سلیم العقل اور سلیم الفطرت انسان بغیر وحی و رسالت کے بھی یہاں تک پہنچ جاتا ہے‘ البتہ اس سے آگے وہ محتاج ہے۔

وہ محسوس کرتا ہے کہ مجھے تفصیلی ہدایت کی ضرورت ہے۔ زندگی میں ہر ہر قدم پر جو دوراہے چوراہے آتے ہیں ان میں کہیں غلط موڑ نہ مڑ جاؤں اور وہ کیفیت نہ ہو جائے کہ ع ’’یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد‘‘ (یا یوں کہہ لیں: ع ’’لمحوں نے خطا کی تھی‘ صدیوں نے سزا پائی!‘‘) انسان ذرا سا غلط موڑ مڑ جائے تو اس کی گمراہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ عملی طور پر زندگی گزارنے کے طور طریقوں میں کدھر جاؤں‘ کدھر نہ جاؤں‘ کیا کروں‘ کیا نہ کروں! خاص طور پر اجتماعیاتِ انسانیہ میں توازن کیسے پیدا کیا جائے؟ فرد اور اجتماعیت کے درمیان حقوق و فرائض کا توازن کیا ہو؟ مرد و عورت کے حقوق کے درمیان اعتدال و توازن کی شکل کیا ہو؟ عدل بھی ہو‘ انصاف بھی ہو‘ اعتدال بھی ہو‘ توازن بھی ہو۔ اسی طرح سرمایہ اور محنت کے درمیان توازن‘ اعتدال اور عدل کیسے ہو؟ یہاں انسان احتیاج اور ضرورت محسوس کرتا ہے اور اس کے لیے وہ درخواست کرتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ تو درحقیقت اسی کے لیے قرآن نازل ہوا۔ اس دعا کا جواب ہے جو یہاں سے شروع ہو رہا ہے:

﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ ’’الف‘ لام‘ میم۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ یہ ہدایت ہے متقیوں کے لیے۔‘‘

متقی شخص کون ہے؟ جس کے اندر اخلاقی حس موجود ہو۔ انسان کی فطرت کی صحت کی علامت جذبۂ شکر اور جذبۂ رحم ہے۔ یہ رحم اور شکر درحقیقت ایک ہی جذبے کے دو رُخ ہیں۔ اگر کسی نے آپ کے ساتھ بھلائی کی تو آپ کے اندر جذبۂ تشکر‘ جذبۂ شکر اُبھرنا

چاہیے۔ اگر کسی کو آپ تکلیف اور احتیاج میں مبتلا دیکھتے ہیں تو آپ کے اندر جذبۂ رحم پیدا ہونا چاہیے۔ یہ دونوں درحقیقت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اگر فطرتِ انسانی اپنی صحت اور سلامتی پر برقرار ہے تو اس کیفیت کا پیدا ہونا لازم ہے۔ انسان کی صحتِ فطرت کی دوسری علامت اور اس کا ثبوت اور مظہر یہ ہے کہ انسان میں نیکی اور بدی کی تمیز موجود ہو۔ گویا کہ اس کی اخلاقی حس بیدار ہو۔ نیکی کی طرف رغبت پائی جائے اور بدی سے ایک گونہ نفرت ہو۔ اگر کسی وقت حالات سے متاثر و مغلوب یا مجبور ہو کر کوئی غلط کام بھی کر بیٹھے تب بھی اُس کو یہ احساس رہے کہ یہ کام غلط ہے جو میں کر رہا ہوں اور یہ میں نے اچھا نہیں کیا۔ گویا کہ ضمیر مردہ نہ ہو گیا ہو‘ ضمیر زندہ ہو۔ یہی کیفیت ہے جو تقویٰ کا نقطۂ آغاز ہے۔

(جاری ہے)

حواشی

(۶) سنن الترمذی‘ کتاب فضائل القرآن‘ باب ما جاء فی فضل القرآن‘ ح ۳۰۸۲‘ امام الترمذی اور علامہ البانی نے حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

(۷) اس اعتبار سے الف ایک حرف ہے۔ اگر ہمزہ کو بھی علیحدہ حرف مان لیا جائے تو ۲۹ بن جائیں گے۔ اگر ہمزہ کو شمار نہ کیا جائے تو ۲۸ رہ جائیں گے۔ دراصل الف پر اگر زبر‘ زیر‘ پیش یا جزم آجائے تو اب یہ ہمزہ ہے۔ اگر کسی حرکت کے بغیر ہے تو الف ہے۔ الف‘ واؤ اور یا حروفِ مدّہ کہلاتے ہیں۔ یہ حروفِ علت بھی ہیں۔ اگر الف سے پہلے کوئی حرف مفتوح ہے (اُس پر زبر آ رہا ہے) تو اسے دو زبر کے برابر کھینچا جائے گا۔ اسی طرح کا معاملہ واؤ ماقبل ضمہ (پیش) اور یا ماقبل کسرہ (زیر) کا بھی ہے۔ لامِ تعریف (ال) کے اندر بھی الف کو شمار نہیں کرتے اور اسے ہمزۂ وصل کہتے ہیں۔

(۸) ایک دوسری فہرست بھی نوٹ فرمالیں:

الٓمّٓ: سورة البقرة، آل عمران، العنكبوت، الروم، لقمان، السجدة
الٓمّٓصٓ: سورة الاعراف
الٓرٰ: سورة يونس، هود، يوسف، ابراهيم، الحجر
الٓمّٓرٰ: سورة الرعد   كٓهٰيٰعٓصٓ: سورة مريم   طٰهٰ: سورة طٰهٰ
طٰسٓمّٓ: سورة الشعراء، القصص (حاشيه از شبير احمد نوراني)

(۹) معجم صغير للطبراني، كتاب العلم، ح ۸۰۔ واخرجه البخاری فی صحیحه (۱۴۳) ومسلم فی صحیحه (۲۴۷۷)

❀❀

تکبیرِ ربّ کا حقیقی مفہوم

سورۃ المدثرؔ کی آیات ۱ تا ۳ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

سورۃ المدثر میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾

پہلی دو آیات کا ترجمہ ہے:

’’اے لحاف میں لپٹنے والے (یا کپڑے میں لپٹنے والے ﷺ!) کھڑے ہوجاؤ، پس خبردار کرو!‘‘

نیند کے ماتوں کو جگاؤ، بیدار کرو۔ یہ جو مدہوش ہیں انہیں فکر ہی نہیں ہے، ان کو خبردار کردو کہ ان کی آخری منزل کون سی ہے، اصل زندگی کون سی ہے۔

اب تیسری آیت پر توجہ کیجیے: ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ ’’اور اپنے رب کی تکبیر یا بڑائی کرو!‘‘ میں نے یہاں پر ’’بڑائی کرو‘‘ کا لفظ استعمال کیا ہے، بہت سے تراجم کے اندر الحمدللہ یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، تاہم اس کے صحیح صحیح مفہوم کو ادا کرنے میں بڑی کوتاہی ہوئی ہے۔ اس کا بھی ایک تاریخی پس منظر ہے۔ تکبیر کے دراصل تین مراحل ہیں۔ تفاسیر میں عام طور پر صرف پہلے یا دوسرے مرحلے تک بات آکر ختم ہوجاتی ہے جبکہ تیسرا مرحلہ ذہن سے نکلا ہوا ہے۔ یہ مرحلہ آج مجھے آپ کے سامنے تفصیل سے رکھنا ہے۔

تکبیر کا معنی ومفہوم

تکبیر کے لفظی معنی کیا ہیں؟ یہ بابِ تفعیل کا مصدر ہے۔ اس وزن پر جو الفاظ آتے ہیں، ان کے حوالے سے اس لفظ کو سمجھا جاسکتا ہے۔ تکبیر کے معنی ہیں کسی شے کو بڑا کرنا یا بڑا

بنانا۔ عربی کا مقولہ ہے: ’’تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا‘‘ یعنی انسان اگر مخالف چیز کو سمجھ لے تو پھر اصل شے بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ چنانچہ تکبیر کی ضد ہے تصغیر اور تصغیر کے معنی ہیں کسی چیز کو چھوٹا کرنا یا چھوٹا بنانا۔ جیسے کتاب سے کتابچہ اسمِ تصغیر ہے۔ تکبیر کے معنی بڑا کرنا یا بڑا بنانا ہے۔ اسی طرح تسہیل ہے۔ بچپن میں ’’تسہیل الاملاء‘‘ ایک کاپی ہوتی تھی جس میں نقطوں کی صورت میں الفاظ لکھے ہوتے تھے۔ ان کے اوپر قلم پھیر کر لکھنا سیکھتے تھے۔ یہ تسہیل الاملاء ہے‘ یعنی املاء کو آسان بنانا۔ پھر باب تفعیل کا ایک خاصہ ہے تدریج یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے کسی کام کو آگے بڑھانا‘ ایک دم نہیں ہوجانا۔ اس کے لیے پیہم‘ مسلسل‘ درجہ بدرجہ کوشش‘ محنت لازم ہے۔ جیسے ایک ہے انزال اور ایک ہے تنزیل۔ انزال کے معنی ہیں دفعتاً کسی شے کو اُتار دینا‘ جب کہ تنزیل کے معنی ہیں تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنا۔ چنانچہ سورۃ النساء کی آیۂ مبارکہ بہت اہم آیات میں سے ہے جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ ایمان کے بالکل علیحدہ علیحدہ دو درجے ہیں۔ اس ایک ہی آیت میں یہ دونوں الفاظ آگئے ہیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾ (آیت ۱۳۶)

’’اے اہلِ ایمان! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور اس کتاب پر بھی جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی ہے (بصورت تنزیل) اور اس کتاب پر بھی جو اس نے پہلے نازل کی تھی (بصورت انزال)۔‘‘

تورات دفعتاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دی گئی جو الواح پر لکھی ہوئی تھی۔ کوہِ طور پر وہ الواح آپؑ کے حوالے کر دی گئیں‘ پوری کی پوری کتاب آپؑ کو مل گئی۔ چنانچہ وہاں ’’انزال‘‘ ہے۔ حضور ﷺ پر قرآن مجید ۲۲ برس میں (قمری حساب سے ۲۳ برس میں) رفتہ رفتہ‘ درجہ بدرجہ‘ تدریجاً‘ تھوڑا تھوڑا کر کے نجماً نجماً نازل ہوا۔ یہ تنزیل ہے۔ اسی طریقے سے اعلام اور تعلیم ہے۔ اعلام سے مراد کسی کو کوئی بات بتا دینا‘ خبردار کر دینا ہے بس۔ اس کے بعد اس نے سمجھا یا نہیں سمجھا‘ اس سے آپ کو غرض نہیں۔ اس کے برعکس تعلیم یہ ہے کہ کسی کو اچھی طرح بات سمجھانا‘ اس کے دماغ میں اچھی طرح اتارنا‘ جائزہ لینا

سمجھا کہ نہیں! پچھلا سمجھا ہوا سبق سننا اور پھر آگے سبق دینا‘ درجہ بدرجہ۔ جو فرق اعلام اور تعلیم میں ہے‘ جو انزال اور تنزیل میں ہے‘ یہ خاصہ ہے باب تفعیل کا۔ اب سمجھیے کہ ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ کے معنی ہوں گے ’’اپنے ربّ کو بڑا کرو!‘‘ اور بہت بڑا کرو‘ اور بہت بڑا کرو۔ یہ مسلسل کرنا ہے۔

اسی طرح ایک لفظ ہے توحید‘ یہ بھی بابِ تفعیل سے ہے۔ ہم نے اسے بس ایک لفظ کی حیثیت سے سمجھا ہوا ہے‘ وہ ایک اصطلاح بن گئی ہے لیکن ایک خطبے میں یہ الفاظ آئے ہیں: ’’يَا اَيُّهَا النَّاسُ وَحِّدُوا اللّٰهَ فَاِنَّ التَّوْحِيْدَ رَأْسُ الطَّاعَاتِ‘‘۔ ’’وَحِّدُوا‘‘ فعل امر کے صیغے میں آیا ہے تاکہ توحید کا ادراک‘ اس کا شعور ذہن کے اندر مسلسل اُترتا جائے۔ اس کا صحیح صحیح ادراک ہو جائے۔ پھر اس کا اعلان بھی کیا جائے‘ اس کے عملی تقاضوں کو بھی پورا کیا جائے۔ ’’توحیدِ عملی‘‘ کے نام سے میری ایک پوری کتاب ہے۔ سورۃ الزمر‘ سورۃ المؤمن‘ سورۂ حٰمٓ السجدہ اور سورۃ الشوریٰ میں توحیدِ عملی زیرِ بحث آئی ہے۔ توحید عقیدے کی حد تک تو یہ ہے کہ مان لیا اللہ ایک ہے‘ اس کی صفات میں کوئی اس کا برابر نہیں‘ کوئی ساجھی نہیں‘ لَا مِثْلَ لَهٗ، لَا مِثَالَ لَهٗ، لَا مَثِيْلَ لَهٗ، لَا ضِدَّ لَهٗ وَ لَا نِدَّ لَهٗ، وَ لَا كُفُوَ لَهٗ۔ ساری بات کہہ دی‘ الفاظ کہہ دیے‘ اب اس یقین کو دل کے اندر واقعتاً بٹھانا ہے۔ اپنے شعور میں‘ اپنے قلب کی گہرائیوں میں بھی اس یقین کو بٹھانا ہے۔ پھر اگلا مرحلہ آتا ہے کہ عملاً اُسی ایک اللہ کا بندہ بن جانا۔ جب اُس کو مانا ہے تو اب کوئی عمل اُس کی مرضی کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔ اُس کی منشا کے خلاف اَعضاء و جوارح میں کوئی حرکت پیدا نہ ہو۔ قدم اس راستے پر چلنے کے لیے نہ اٹھے کہ جس پر چلنے سے اُس نے روک دیا ہے۔ زبان نہ کھلے وہ لفظ نکالنے کے لیے کہ جس کا نکلنا اُس کو پسند نہیں۔ یہ توحیدِ عملی ہوئی۔ ایک ہی رب کی اطاعت و بندگی میں اپنے پورے وجود کو‘ اپنی پوری شخصیت کو دے دینا۔ اسی کی پھر آخری منزل ہے کہ ایک ہی رب کا نظام قائم ہو جائے۔ یہ اجتماعی سطح پر توحیدِ عملی ہوگی۔

بیسویں صدی میں اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو ایک توفیق دی تھی کہ ہمارے ہاں

’’قراردادِ مقاصد‘‘ پاس ہوگئی‘ اگرچہ ابھی تک اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہو سکتا ہے کچھ عرصہ بعد میں کوئی بات اچھی نکل ہی آئے۔ ہمیں امید تو اچھی رکھنی چاہیے۔ ع ’’پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ!‘‘ جب ہمارے ہاں ’’قراردادِ مقاصد‘‘ پاس ہوئی تو یہ کسی معجزے سے کم بات نہیں تھی کہ بیسویں صدی کے وسط میں ایک قوم نے یہ اقرار کیا کہ ہمارا معبود اور ہمارا حاکم اللہ ہے۔ حاکمیت (Sovereignty) اللہ کی ہے۔ ہمیں جو بھی اختیار حاصل ہے وہ ہمارا ذاتی نہیں بلکہ اللہ کا دیا ہوا ہے۔ ہم اسے اللہ کی معیّن کردہ حدود ہی کے اندر استعمال کریں گے۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ اگر اس کا عملی تقاضا پورا کر دیا جائے کہ پورا اجتماعی نظام واقعتاً اللہ ربّ العزت کے دین کے تابع ہو جائے تو یہ توحیدِ عملی ہے۔

تکبیرِ ربّ کے تین مرحلے

اب اسی پر ’’تکبیر‘‘ کو قیاس کیجیے۔ اس کے بھی تین مرحلے ہوں گے۔ پہلے تو شعور اور ادراک میں ہو کہ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اَللّٰہُ اکبر! انسان کو اس کا پختہ یقین حاصل ہو۔ اپنے اندر اللہ ربّ العزت کی عظمت کا نقش واقعتاً قائم ہو گیا ہو۔ یہ نہیں کہ بس صرف زبان سے ایک زوردار آواز نکال کر ’’نعرۂ تکبیر: اللہ اکبر‘‘ کہہ دیا‘ بلکہ یہ کہ اس کا گہرا شعور ہو کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔ تمام اسباب اُس کے تابع ہیں۔ کوئی پتّا بھی اُس کی مرضی کے بغیر جنبش نہیں کر سکتا۔ پوری کائنات کے تختِ حکومت پر وہ متمکّن ہے۔ اس کی بادشاہی پوری کائنات پر عملاً قائم ہے۔ یہ تو صرف عالَمِ انسانیت ہے یا جنّات کی دنیا ہے جہاں کچھ فساد اور سرکشی ہے‘ ورنہ پوری کائنات جس کی پہنائیوں کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے‘ وہ تو سب ﴿وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝۸۳﴾ (آلِ عمران) کی بنیاد پر قائم ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے تو ہر شے سربسجود ہے اور اُسی کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔ جو بھی آسمانوں میں اور زمین میں ہیں‘ خواہ اپنی مرضی اور پسند سے خواہ مجبوری سے‘ اُس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اُس کی حکومت پوری کائنات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا یہ نقش قائم ہو۔ اللہ کی کبریائی کا ہمیں اپنے قلب کی گہرائیوں کے اندر واقعتاً ادراک اور شعور ہو۔ یہ پہلا مرحلہ

ہے۔ اس کی کوشش کرنی پڑے گی۔ اس کے لیے اپنے ذہن‘ اپنے شعور کی تربیت کرنی ہوگی۔ اس کا اقرار‘ اعلان اور اعتراف تکبیرِ ظاہر ’’اللہ اکبر‘‘ کی صورت میں پہلا قدم ہوا۔ یہ تکبیرِ باطنی ہے۔

تکبیرِ رب کا دوسرا مرحلہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا اعلان و اعتراف ہے۔ ہمارے ذہن میں تکبیر کا صرف یہی مرحلہ بیٹھا ہوا ہے کہ ’’اللہ اکبر‘‘ کہنا‘ اسے بار بار کہنا۔ اللہ کی کبریائی کا اظہار کرنا۔ میں ان چیزوں کی نفی نہیں کرتا۔ ان کا فائدہ ہے۔ اپنی جگہ پر یہ بھی ذکر کی ایک شکل ہے۔ جو وقت اس میں لگتا ہے یقیناً اس کا اجر و ثواب انسان کو ملے گا۔ پھر یہ کہ کچھ نہ کچھ شعور کے اندر بھی یہ بات اُترتی ہے۔ اگر انسان ذرا سا بھی سوچ سمجھ کر یہ الفاظ کہہ رہا ہو تو یہی چیز اسے اپنے باطن کے اندر تکبیر کے معانی کو اُتارنے میں مدد دے گی۔ اگر یہ ’’اللہ اکبر‘‘ کہنا صرف زبان کی نوک ہی پر رہ جائے‘ نہ تو یہ اندر کی تکبیر ہو جو خود اپنے شعور‘ ادراک اور احساس کے اندر اُتر جاتی ہے اور نہ تیسرا مرحلہ پیشِ نظر ہو تو پھر یوں سمجھیے کہ ذہن سے بالکل ہی نکل گیا کہ تکبیر کے معنی یہ بھی ہیں کہ اللہ کے دین کو قائم کرو‘ اللہ کے دین کو غالب کرو۔ ’’لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا‘‘ تا کہ اللہ کا کلمہ ہی سب سے بلند ہو جائے۔ اللہ کے حکم کے سامنے کسی کی گردن اکڑی نہ رہ جائے۔ اللہ کی مرضی کے سامنے کوئی اور اپنی مرضی چلانے والا نہ رہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو پھر تکبیر عملاً تو نہیں ہو رہی۔ یہ تو صرف قولی تکبیر ہے‘ صرف عقیدے کی تکبیر ہے۔ عمل میں‘ حقیقت میں‘ واقعات کی دنیا میں تو کسی اور کا سکّہ چل رہا ہے‘ کسی اور کی مرضی کے مطابق نظام چل رہا ہے۔ گویا لوگوں نے کہا کہ ہم خود اپنے معاملات کے مالک ہیں اور جو چاہیں گے‘ قانون بنائیں گے۔ قانون سازی کا اختیار ہمارے ہاتھ میں ہے‘ حاکمیت ہماری ہے۔ اللہ کے مدِّمقابل لوگ کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ فساد ہے‘ یہ بغاوت ہے۔ فرض کیجیے کوئی فردِ واحد بیٹھا ہوا ہے اور ’’کوسِ لمن الملک‘‘ بجا رہا ہے کہ میرے ہاتھ میں اختیار ہے‘ مَیں جو چاہوں فیصلہ کروں‘ جیسے فرعون نے کہا تھا:

﴿وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٥١﴾﴾ (الزخرف)

’’اور فرعون اپنی قوم میں پکارا کہ اے میری قوم! کیا مصر کی سلطنت میرے لیے نہیں اور یہ نہریں میرے نیچے بہتی ہیں‘ تو کیا تم دیکھتے نہیں!‘‘

کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ کیا آب پاشی کا یہ سارا نظام میرے کنٹرول میں نہیں ہے؟ جس کو چاہوں پانی دوں‘ جس کو چاہوں نہ دوں۔ یہ سارا اختیار میرے ہاتھ میں ہے‘ لہٰذا میرا حکم چلے گا۔ چنانچہ ایک فرد کی حاکمیت سے جمہور کی حاکمیت تک‘ یہ سب درحقیقت اللہ کے نِدّ‘ اللہ کے ضد‘ اللہ کے مدِّمقابل‘ اللہ کو چیلنج کرنے والے بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں‘ اور اگر بالفعل انہی کا سکّہ رواں ہے تو اللہ بڑا کہاں ہے! اللہ تو شاید صرف مسجد کی چار دیواری میں بڑا ہے بلکہ وہاں بھی اکثر و بیشتر اللہ کی بڑائی نہیں ہوتی۔ چودھریوں کی بڑائی ہوتی ہے‘ بے چارے امام کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ جو منتظمین ہیں اور جو تنخواہیں دیتے ہیں‘ ان کا سکّہ چل رہا ہوتا ہے۔

ایک ہے اللہ کی کبریائی کا ادراک اور شعور۔ یہ احساسات میں‘ ذہن میں‘ شعور میں‘ سوچ کے اندر پیوست ہو چکی ہو۔ اللہ کی عظمت‘ اس کی کبریائی کا نقش قائم ہو چکا ہو۔ نمبر دو‘ اس کا اعلان ہے۔ زبان سے کہنا ہے۔ اس کی تکرار بھی ہے‘ اس کا نعرہ بھی ہے‘ اس کو بلند آواز سے بھی کہنا ہے اور خاموشی سے بیٹھ کر اس کی مالا جپنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اس کا بھی فائدہ ہے لیکن اصل شے ہے ’’عملی تکبیر‘‘ یعنی اس تکبیر یا اس کبریائی کی تنفیذ اور اس کی تعمیر۔ وہ نظام برپا کیا جائے جس میں واقعتاً اللہ ’’اکبر‘‘ ہو جائے۔ اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔ اُس کی بات کے سامنے کسی کی بات‘ اُس کی مرضی کے سامنے کسی کی مرضی‘ اُس کے حکم کے سامنے کسی کا حکم‘ اُس کی منشا و مشیت کے سامنے کسی اور کی خواہش پرکاہ کے برابر وقعت نہ رکھتی ہو۔ جب تک یہ بات نہیں ہوتی‘ تکبیر کہاں ہوئی! یوں سمجھیے کہ درحقیقت ان تین آیات میں حضور ﷺ کی سیرت کا پورا خلاصہ ہے۔ اے محمد ﷺ! اب اس غور و فکر کے دَور سے نکلیے‘ سوچ بچار کے مرحلے کو ختم کیجیے‘ کھڑے ہو جائیے۔ کھڑے ہونے کے بعد کام کیا کرنا ہوگا؟

دعوت کی اساس اور ہدف

اب دعوت دینی ہے۔ دعوت کی اساس اور بنیادی بات کیا ہوگی؟ انذارِ آخرت: ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲﴾ ۔سفر میں پہلا قدم رکھ دیا ہے تو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہدف کیا ہے! جانا کہاں ہے؟ منزل کیا ہے؟ ایک تو وہ آخرت کی منزل ہے‘ لیکن اس دنیا میں آپ کا مشن کیا ہے! فرضِ منصبی کیا ہے؟ آپ کو کہاں تک جانا ہے؟ مجھے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور مولانا حمید الدین فراہی (رحمہما اللہ) کی اس رائے کے ساتھ پورا اتفاق ہے‘ میری رائے پہلے سے بھی تھی اور جب ان حضرات کی رائے بھی علم میں آئی تو میں نے اس کا بھی حوالہ دیا ہے کہ سورۃ المزمل میں جو الفاظ آئے تھے: ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝۵﴾ ’’عنقریب ہم آپ پر (اے محمدﷺ!) بہت بھاری بات ڈالنے والے ہیں‘‘ اس کا مصداق یہی (سورۃ المدثر کی ابتدائی) آیات ہیں اور ان میں اصل مصداق یہ آیت نمبر تین ہے۔ اس لیے کہ محض زبانی کلامی دعوت کو لوگ برداشت بھی کر لیتے ہیں کہ چلیے ٹھیک ہے کہتے رہیں جو کہتے ہیں‘ اگر انہیں یہ معلوم ہو He doesn't mean it ۔اگر وہ یہ سمجھیں کہ وعظ کہنے آیا تھا‘ وعظ کہہ کر چلا گیا‘ ہمیں کچھ کڑوی کسیلی بھی سنا گیا‘ کوئی بات نہیں۔ البتہ اگر یہ معلوم ہو کہ وہ ڈنکے کی چوٹ کھڑا ہو جائے گا کہ جو بات میں نے کہی ہے I mean it‘ میں اسے نافذ کرواؤں گا تو معاملہ اور ہوگا۔ میں عدل اور انصاف کا علم بردار بن کر آیا ہوں۔ مجھے حکم ہوا ہے ۔جیسے سورۃ الشوریٰ میں آیا: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ ؕ﴾ ’’اور (کہہ دیجیے کہ) مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل قائم کروں۔‘‘ میں صرف واعظ بن کر نہیں آیا: ﴿اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۴۲﴾ (الشوریٰ) ’’مواخذہ تو اُنہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی پھیلاتے ہیں۔ اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔‘‘ اصل میں ساری ملامت تو ان لوگوں کے لیے ہے جو لوگوں کے حقوق غصب کرتے ہیں‘ لوگوں پر ظلم کرتے ہیں‘ ناانصافیاں کرتے ہیں اور خود زمین کے اندر ناحق سرکشی اختیار کرتے ہیں۔ بڑائی کا حق تو

صرف اللہ کا ہے۔ کبریائی صرف اُس کے لیے‘ حاکمیت صرف اُس کے لیے ہے۔ ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی‘ باقی بتانِ آزری!

جو بھی مدِمقابل بن کر آیا وہ گویا کہ اللہ کو چیلنج کر رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر اللہ کی حاکمیت کی نفی کر رہا ہے۔ لہٰذا اب اس کام کے لیے رسول ﷺ کو کھڑا کیا گیا ہے کہ آپؐ کو ان سب کے ساتھ پنجہ آزمائی کرنا ہوگی۔ ان سب نے لوگوں کی گردنوں پر اپنی اپنی کبریائی کے‘ اپنی اپنی خدائیوں کے جوئے رکھے ہوئے ہیں۔ ان سب سے نوعِ انسانی کو آزاد کرانا ہے اور اللہ کی بندگی پر لانا ہے۔ توحیدرب عملی اعتبار سے بلند ترین اجتماعی سطح پر بھی نافذ کرنا آپ ﷺ کا فرضِ منصبی ہے۔ اس سے وہ مشن معیّن ہوا۔

قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب ہے جس کو سورۂ ہود کے آغاز میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ خَبِیْرٍ ۝۱﴾

’’الف‘ لام‘ را‘ یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات (پہلے) بڑی محکم کی گئیں‘ پھر ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے اُس ہستی کی طرف سے جو حکیم اور خبیر ہے۔‘‘

پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے احکام کو خوب مضبوط اور پختہ کیا گیا۔ پھر اس کی تفصیل بھی اُسی ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب سے ہوئی۔ چنانچہ ابتدا میں تو گویا دریا کوزے میں بند کیا گیا ہے۔ ایک ایک لفظ کے اندر حقائق اور معارف ہیں۔ یہی چیزیں بعد میں جا کر کھلی ہیں۔ چنانچہ یہی ’’تکبیرِ ربّ‘‘ بعد میں ان اصطلاحات کے حوالے سے آئی: ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ ’’دین کو قائم کرو۔‘‘ یہی چیز تین مرتبہ مدنی سورتوں میں آئی: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ ’’وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایتِ کاملہ اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔‘‘ ان الفاظ کے بعد سورۃ التوبۃ اور سورۃ الصّف میں ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ کے الفاظ ہیں‘ یعنی چاہے مشرک کتنا ہی بُرا مانیں‘ جبکہ سورۃ الفتح میں فرمایا: ﴿وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝۲۸﴾ ’’اور اللہ کافی ہے بطور گواہ۔‘‘ باقی آیت ہر جگہ یکساں الفاظ کے ساتھ آئی

ہے‘ ایک شوشے کا فرق نہیں ہے۔ یہ ہے درحقیقت ہدف۔ بتا دیا گیا کہ جانا کہاں ہے! یہ ہے آخری منزل۔ آپ ﷺ کی جِدّوجُہد میں اصل بوجھل کام یہی ہے‘ اصل ثقیل کام یہی ہے۔ جھوٹے خداؤں کی خدائی کا انکار کرنا‘ جنہوں نے اپنی محکومی کے جوئے رکھے ہوئے ہیں لوگوں کی گردنوں پر‘ ان کو اس سے نجات دلانا۔ جیسے کہ فاتح ایران سعد بن ابی وقاص ؓ یا ان کے کسی ایلچی کا وہ مشہور جملہ تاریخ کے اندر آیا ہے کہ ہمیں تو بھیجا گیا ہے‘ ہم مشن پر ہیں‘ اللہ نے بھیجا اپنے رسول کو اور رسول ﷺ نے بھیجا ہمیں۔ مشن یہ ہے کہ لوگوں کو گمراہی کے اندھیروں سے نکالنا ہے۔ انہیں ہدایت‘ ایمان اور معرفت کی روشنی کی طرف لانا ہے۔ لوگوں کو بادشاہوں کے ظلم وستم سے نکال کر اسلام کے عدل و انصاف کے نظام سے روشناس کرنا ہے۔ گویا کہ ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲﴾ میں حضور ﷺ کی نبوت اور رسالت کے مشن کا نقطۂ آغاز معیّن ہوا ہے جبکہ ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ میں اس کی منزل کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کی جِدّوجُہد کا ہدف کیا ہے!

عام دُنیاوی اعتبار سے بھی ذرا عمومی انداز سے اس بات کو سمجھ لیجیے۔ ہر تحریک کے معاملہ میں دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک‘ یہ تعین ہو کہ شروع کہاں سے کرنا ہے۔ اگر غلط سمت میں قدم اٹھالیا تو گویا آئندہ کے مرحلہ کا سارا کام غلط ہوجائے گا۔ غلطی بڑھتی چلی جائے گی چونکہ سمت ہی غلط معیّن ہوئی ہے۔ دوسرا‘ یہ معلوم ہو کہ ہدف کیا ہے! وہ نہ ہو کہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے: ؏ ’’آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!‘‘ اگر ہدف صحیح معیّن نہیں ہوا‘ تب بھی منزلِ مقصود تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک ہی جگہ پر دائرے میں گھومتے رہیں اور یہ سمجھیں کہ ہماری حرکت تو جاری وساری ہے لیکن پیش قدمی تو ہوگی ہی نہیں کیونکہ ہدف ہی معیّن نہیں ہے۔ ایک ہی جگہ پر کھڑے ہوئے اچھل کود کر رہے ہیں۔ پسینہ بھی آرہا ہے‘ تھک بھی رہے ہیں‘ لیکن ایک انچ بھی سفر آگے طے ہی نہیں کیا۔ لہٰذا ہدف کا بھی تعین صحیح ہونا چاہیے اور اس کے لیے نگہ بلند‘ سخن دل نواز‘ جاں پُرسوز کی صفات پیدا ہونی چاہئیں۔ بلند ترین ہدف نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیے۔ ابھی ابتدائی مرحلے میں ہوں تو اس کا بھی شعور ہو لیکن یہ نہ ہو کہ کہیں کسی بھی

درمیانی مرحلے کو یہ قرار دے لیں کہ بس منزل پر پہنچ گئے۔ اس سے تو آئندہ کی پوری تحریک بالکل غیر مؤثر ہوکر رہ جائے گی۔

ہدف معیّن رہنا چاہیے لیکن یہ بھی معلوم ہو کہ تحریک شروع کہاں سے ہوگی۔ کسی نے جمہوریت کا نعرہ لگا دیا‘ یا کہیں سوشل ازم کا نعرہ لگا‘ یا کہیں کسی اور نے نعرہ لگایا اور اگر ہم نے دیکھا کہ وہ نعرے چل گئے‘ جیسے ’’روٹی کپڑا اور مکان‘‘ کا نعرہ چل گیا تھا تو ؏ ’’آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!‘‘ ہوسکتا ہے کہ ہمارا بھی کام بن جائے۔ ایک نعرے سے ایک شخص نے پوری قوم کے اندر بجلی بھر دی تھی تو ہم بھی ویسا ہی کوئی نعرہ استعمال کرلیں۔ کوئی جذباتی نعرہ سوائے اس انذارِ آخرت کے اگر اختیار کیا گیا تو وہ دعوت علیٰ منہاج النبوۃ نہیں ہوگی۔ اصل شے یہی ہے کہ آخرت کا یقین گویا کہ ایمان‘ ایمان کی جِدّوجُہد۔ اسی سے پھر وہ ہدف معیّن ہوگا۔ آخرت کی باز پرس کا احساس پیدا ہوگا۔

محاسبۂ اُخروی کا احساس

خاص طور پر مسلمانوں میں ایک اور کام کرنا بہت ضروری ہے کہ محاسبۂ اُخروی کا حقیقی احساس پیدا کیا جائے۔ درحقیقت انکارِ آخرت کی بھی کئی شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کوئی آخرت ہے ہی نہیں: ﴿اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝۳۷﴾ (المؤمنون) ’’زندگی تو صرف ہماری دنیا کی زندگی ہے‘ ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔‘‘ کوئی آخرت نہیں‘ دوبارہ پیدا ہونا ممکن ہی نہیں‘ مٹی ہوکر مٹی میں مل جائیں گے‘ بس یہی خاتمہ ہے۔ عہدِ رسالت میں کچھ لوگ ایسے موجود تھے جن کا قول قرآن مجید میں ایک سے زائد جگہ پر نقل ہوا کہ کوئی بعث بعد الموت نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ بعث بعد الموت تو برحق ہے لیکن ہمارے کوئی سفارشی بیٹھے ہوئے ہیں جو ہمیں بچالیں گے۔ معلوم ہوا کہ آخرت کے عقیدے کا عمل پر جو اثر ہوسکتا تھا وہ ختم ہوگیا۔

اس کے علاوہ آخرت کے انکار کے کچھ اور بھی انداز ہیں۔ مثلاً اس دنیا میں بعض لوگوں کو اللہ نے دولت دی یا حیثیت دی‘ وجاہت دی‘ تو انہوں نے اسی کو دلیل بنالیا کہ ہم

اللہ کے بہت لاڈلے اور پیارے ہیں‘ لہٰذا ہم سے تو کوئی محاسبہ وغیرہ نہیں ہوگا۔ یا یہ کہ ہم تو فلاں کا دامن پکڑے ہوئے ہیں‘ ان کے ساتھ نکل ہی جائیں گے۔ یا کسی شخصیت کی اولاد یا اس سے متعلق ہونے کی بنا پر ہمارا محاسبہ نہیں ہوگا۔ یہودی کہتے تھے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں‘ ہم تو اللہ کے بیٹوں کی مانند ہیں‘ اس کے بڑے چہیتے اور لاڈلے ہیں: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ﴾ (المائدۃ:۱۸) ’’اور کہا یہودیوں اور عیسائیوں نے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اُس کے پیارے ہیں۔‘‘ ہمیں تو اگر اُس نے جہنم میں ڈالا بھی تو گنتی کے چند دن ﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ﴾ (البقرۃ:۸۰) ’’اور انہوں نے کہا کہ ہمیں ہرگز آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔‘‘ اور یہ بھی دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کہ لوگ اعتراض نہ کرسکیں کہ یہ کیا ناانصافی ہو رہی ہے‘ اس لیے ہمیں اگر وہ جہنم میں جھونک بھی دے تو فوراً نکال لے گا۔ سب سے انوکھا انداز یہ ہے کہ وہ بڑا غفور و رحیم ہے‘ بڑا نکتہ نواز ہے۔ گویا جہنم کی یہ ساری خبریں اور دھمکیاں تو صرف شاعری ہے یا لفاظی ہے۔ معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ! لوگ چاہے یہ الفاظ نہ کہیں لیکن سب سے لطیف انداز یہی ہے۔ سورۃ الانفطار کا تو مرکزی مضمون ہی یہی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝۶ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝۷ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝۸ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝۹﴾

’’اے آدمی! تجھے کس چیز نے فریب دیا اپنے کرم والے رب سے۔ جس نے تجھے پیدا کیا‘ پھر ٹھیک بنایا‘ پھر ہموار فرمایا‘ جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دیا۔ کوئی نہیں بلکہ تم انصاف ہونے کو جھٹلاتے ہو۔‘‘

درحقیقت اس پردے میں کہ اللہ بڑا غفور ہے‘ بڑا رحیم ہے‘ تم جزا و سزا کا انکار کر رہے ہو۔ جزا اور سزا کا انکار صرف یہی نہیں ہے کہ کوئی بعثِ بعد الموت نہیں‘ کوئی حساب کتاب نہیں۔ انکارِ آخرت کی درجہ بدرجہ بہت سی چھپی ہوئی شکلیں ہیں‘ مخفی صورتیں ہیں جن میں محاسبۂ اُخروی کے فکر کو انسان اپنے ذہن سے نکال کر دور رکھ دیتا ہے۔ بس عقیدے کی

ایک پوٹلی رہ جاتی ہے کہ ہاں آخرت ہے لیکن اس کی کوئی فکر دامن گیر نہیں ہوسکتی۔ ان تمام چیزوں کا رد کر کے ہی کہیں جا کر لوگوں کے اندر مسؤلیت کا احساس پیدا ہوگا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝۴۰ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝۴۱﴾ (النّٰزعات)

’’اور وہ جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش سے روکا‘ تو بے شک جنّت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔‘‘

جب تک یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو یوں سمجھیے کہ دعوت سیدھے رخ پر نہیں ہے۔ باقی پاس کیا گیا ہے یا کسی اور حوالے سے کسی اور چیز کو اپیل کر کے لوگوں کو جمع کرلیا ہے۔ دنیا میں تو سارے دھندے چل رہے ہیں۔ آخر کمیونسٹ انقلاب بھی آتے ہیں‘ سیاسی انقلابات بھی آجاتے ہیں‘ تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ اس طرح کی کوئی تبدیلی آپ بھی لے آئیں گے لیکن وہ ویسی تبدیلی نہیں ہوگی جو رسولوں کے ذریعے سے آئی ہو۔ وہ تبدیلی نہیں ہوگی جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے آئی‘ اس لیے کہ اس کے لیے نقطۂ آغاز ہے انذار۔

اصل ہدف: تکبیرِ عملی

اسی کے بالکل ہم وزن ایک دوسرا معاملہ بھی بہت اہم ہے۔ شروع تو یہاں سے کر دیا لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ منزل کیا ہے تو محض ایک تبلیغی انداز‘ اصلاحی انداز‘ واعظوں کا سا انداز ہے۔ وعظ ہی کہتے پھر رہے ہیں۔ بس اسی میں محنت ہو رہی ہے‘ صلاحیت لگ رہی ہے‘ وقت لگ رہا ہے‘ اطمینان ہو رہا ہے۔ یہ وہی دائرے میں گھومنے والی بات ہے۔ جب تک کہ یہ معیّن نہ ہو جائے جو تیسری آیت نے تعین کر دیا کہ جانا کہاں ہے: ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ وہ ربّ کی کبریائی کہ جس کو علامہ اقبال نے انتہائی خوب صورتی سے اردو اشعار میں بیان کیا ہے۔ ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات!

بس زبان سے ''سبحان اللہ''، ''سبحان اللہ'' اور ''اللہ اکبر'' کی تسبیح کرتے رہو۔ خاک کے آغوش میں یہ جو تسبیح و مناجات ہیں' اس کا تقابل ہے : ''یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل!'' ''اللہ اکبر'' کا نعرہ اس ارادے اور شعور کے ساتھ' اس احساس کے ساتھ' یہ ہدف معیّن کرتے ہوئے کہ یہ صرف تکبیر قولی نہیں بلکہ عملی طور پر تکبیر کرنی ہے۔ ہمیں اللہ کو واقعتاً بڑا بنانا ہے' بایں معنی کہ ہر جگہ پر' زندگی کے ہر گوشے میں اس کی بڑائی نافذ ہو' اس کی بڑائی مانی جائے۔ پورے اجتماعی نظام کو اس کے تابع لایا جائے۔ اس کے لیے جدّ وجُہد ہے۔ ظاہر بات ہے کہ پھر جو بڑے بنے ہوئے ہیں' ان کی بڑائی کا انکار کیا جائے گا اور وہ لوگ جو بڑائی کا دعویٰ کر رہے ہیں یعنی ﴿یَبۡغُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ﴾ (الشوریٰ:۴۲) وہ تو کبھی ٹھنڈے پیٹوں اس تحریک کو برداشت نہیں کریں گے۔ ان کے مفادات' ان کی سیادتیں' ان کی چودھراہٹیں' ان کی مسندیں' ان کا اقتدار' ان کی قوت' ان کی مراعات جو انہیں ملی ہوئی ہیں ان سب کو چیلنج کرنا پڑے گا۔ تب جا کر کہیں ﴿وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ ۳﴾ کے حکم پر عمل ہوگا۔ لہٰذا اصل میں ﴿اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ۵﴾ ''ہم تو آپؐ پر عنقریب ایک بہت بھاری بات ڈالنے والے ہیں'' کا مصداق ہیں یہ تینوں آیات: ﴿یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ ۱ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۲ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ ۳﴾ لیکن میرے نزدیک سب سے بڑھ کر تیسری آیت اس کا مصداق ہے۔ اس میں درحقیقت وہ ہدف مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے دستِ مبارک سے اس تکمیلی مرحلے تک پہنچایا ہے' جس میں یقیناً اللہ کی مدد بھی شامل حال رہی ہے۔ البتہ اللہ کی مدد کا اپنا ایک نظام ہے' اس کی اپنی شرائط ہیں۔ انسان اپنا سب کچھ لا کر میدان میں ڈال دے' اپنا وقت' اپنی صلاحیتیں' اپنی قوتیں' اپنا پیسہ' تب اللہ کی مدد آتی ہے۔ اگر اپنے آپ کو بچا بچا کر رکھنا ہو اور دعا کرنا ہو' تو لاکھ گڑگڑا لیں' اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں آئے گی۔ ﴿اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ﴾ (محمد:۷) ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔'' تم اپنا سب کچھ لا کر جھونک دو' ڈال دو' لگا دو پھر اللہ سے مدد مانگو تو مدد آتی ہے۔ جب تک انسان خود کمر نہ کس لے اور اس کے لیے شرائط پوری نہ کر لے تب تک اللہ کی مدد نہیں آتی۔ قرآن مجید میں بھی

نقشے کھینچے گئے ہیں کہ جب رسول اور ان کے ساتھیوں پر تکالیف آتی تھیں تو وہ اللہ تعالیٰ کو پکارتے تھے:

﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ وَ لَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ مَسَّتۡہُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلۡزِلُوۡا حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ ۲۱۴﴾ (البقرۃ)

''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنّت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تمہارے اوپر وہ حالات و واقعات وارد نہیں ہوئے جو تم سے پہلوں پر ہوئے تھے۔ پہنچی اُن کو سختی بھوک کی اور تکلیف اور وہ ہلا مارے گئے' یہاں تک کہ (وقت کا) رسول اور اُس کے ساتھی اہلِ ایمان پکار اٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی مدد؟ (اب انہیں یہ خوشخبری دی گئی کہ) آگاہ ہو جاؤ' یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے۔''

ان پر تکالیف آئیں' مصیبتیں آئیں۔ طرح طرح کی تکالیف کو انہوں نے جھیلا۔ وہ ہلا مارے گئے' یہاں تک کہ وقت کے رسول اور ان کے ساتھی اہلِ ایمان پکار اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی! تب انہیں مژدہ سنایا گیا کہ اللہ کی مدد آیا چاہتی ہے: ﴿اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ ۲۱۴﴾

اصل ہدف سے صرفِ نظر کیوں؟

''تکبیرِ ربّ'' کا تیسرا مرحلہ نگاہوں سے اوجھل کیوں رہا؟ تفاسیر میں اس تیسری بات کا ذکر نہیں ملتا' حالانکہ میرے نزدیک بیسویں صدی کے اندر ایسی تحریکیں اُٹھی ہیں جنہوں نے بالفعل اس تصور کو اجاگر کر دیا ہے۔ البتہ قرآن مجید میں اس تصور کے لیے جو مختلف اصطلاحات ہیں' ابھی تک ان سب کی اس طرف نگاہ نہیں گئی ہے۔ کسی کے سامنے وہ آیت تو آ گئی:

﴿ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ﴾

اس کا مفہوم تو واضح ہو گیا کہ اللہ نے اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر بھیجا ہی اس لیے ہے تاکہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل نظام زندگی پر۔ اسی طرح کچھ

لوگوں کے سامنے مزید بڑھ کر وہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ﴿اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ﴾ کا مطلب ہے اللہ کے دین کو اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ قائم کیا جائے۔ تاہم میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس تصور کو سمجھنے کی ابھی تک ضرورت ہے کہ اس کی جو جڑ بنیاد ہے' وہ آیہ مبارکہ ذہن سے کیوں اوجھل ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ چیزیں منکشف ہو رہی ہیں' اس لیے کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ جب کوئی چیز سامنے ہی نہ رہے تو وہ ذہن سے بھی اوجھل ہو جائے گی۔

ہوا یہ ہے کہ اللہ کی سیاسی کبریائی یا حکومت اور ریاست کی سطح پر کبریائی ہمارے ہاں بہت جلد ختم ہوگئی۔ خلافتِ راشدہ کے بعد بادشاہت شروع ہوگئی' جاگیرداریاں شروع ہوگئیں۔ محل بن گئے اور شان وشوکت آگئی۔ شروع میں تو پھر بھی غنیمت تھی۔ بنواُمیہ کے دور میں تو ابھی وہ شان وشوکت والی باتیں نہیں تھیں۔ ابھی محل نہیں بنے تھے' ان کی وہ بدویانہ سادگی سلامت تھی لیکن جیسے جیسے بنوعباس کا دور آیا تو بڑے بڑے عالی شان محل بن گئے۔ پھر جہاں تک بنواُمیہ کی اس شاخ کا تعلق ہے جو سپین میں گئے' انہوں نے بھی بڑے بڑے محل بنائے' الحمرا بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کی بڑائی کا یہ تصور ذہن سے اوجھل ہوگیا اور دوسری بڑائیاں بالفعل سامنے آگئیں۔ ان بڑائیوں کے خلاف ابتدا میں کوششیں بھی ہوئیں۔ حضرت حسینؓ' حضرت عبداللہ بن زبیرؓ' حضرت زید رحمہ اللہ' حضرت نفس زکیہ رحمہ اللہ نے کوششیں کیں جو ناکام ہوگئیں۔ البتہ اس کے بعد سے ذہناً سمجھوتہ کر لیا گیا کہ اب یہ معاملہ جیسے چل رہا ہے' چلتا رہے۔ کم از کم لوگوں کے اخلاق تو درست کرو' لوگوں کو دین کی صحیح تعلیم تو دے دو' لوگوں کے عقائد صحیح رکھو' لوگوں کے اندر آخرت کی طرف رجحان تو باقی رہے' لوگوں کے دل میں اللہ کی محبت تو ہو۔ چنانچہ ہمارے جتنے بھی مخلصین تھے' اتقیاء' صلحاء' صوفیاء' اولیاء اللہ انہوں نے اس کبریائی کی چھت کے نیچے نیچے تو سارا کام جاری رکھا' لیکن عصبیت قبائلی' عصبیتِ قومی جیسی کوئی نہ کوئی عصبیت بالاتر رہی ہے۔ سیاسی نظام' حکمرانی کا نظام اس کے بل پر قائم رہا۔ لہٰذا یہ چیزیں رفتہ رفتہ ذہن سے اوجھل ہوگئیں کہ اللہ کی کبریائی کا جو مقامِ مقصود ہے' جو ہم سے مطلوب ہے' وہ تو یہ ہے کہ اللہ کی اس کبریائی' اس تکبیر کے لیے تن من دھن لگا دیں۔ ع

زِ نوری سجدہ می خواہی' زِ خاکی بیش ازاں خواہی!

"تو فرشتوں سے تو صرف سجدوں کی تمنا رکھتا ہے' لیکن خاکی انسان سے سجدے کے علاوہ جان لٹانے کی طلب بھی رکھتا ہے۔"

اس خاکی انسان سے اللہ تعالیٰ نہ معلوم کیا کچھ چاہتا ہے! گردنیں کٹواؤ میری بادشاہی قائم کرنے کے لیے' اپنے تن من دھن لگا دو میری حکومت برقرار رکھنے کے لیے' یا اگر اس کو ہٹا دیا گیا ہے تو اس کو از سرِنو استوار کرنے کے لیے۔ شہنشاہیت کی اصل بساط تو درحقیقت بنوعباس کے دَور میں بچھی' اس لیے کہ ان کی پشت پر اصل قوت ایرانیوں کی تھی اور ایرانیوں کا تو شروع ہی سے مزاج شہنشاہیت والا ہے۔ ان کا ایک خاص مزاج نسلاً بعد نسلٍ بن چکا تھا۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث ہے جس میں وہ یہ فرماتے ہیں:

حَفِظْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وِعَائَیْنِ، فَاَمَّا اَحَدُھُمَا فَبَثَثْتُہٗ، وَاَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُہٗ قُطِعَ ھٰذَا الْبُلْعُوْمُ (ح:۱۲۰)

"میں نے رسول اللہ ﷺ سے (علم کے) دو برتن یاد کر لیے ہیں' ایک کو تو میں نے پھیلا دیا ہے' اور دوسرا برتن اگر میں پھیلاؤں تو میرا یہ نرخرا کاٹ دیا جائے گا۔"

یعنی مجھے رسول اللہ ﷺ سے علم کے دو برتن ملے۔ ایک برتن سے میں تم لوگوں تک علم پہنچا رہا ہوں' تمہاری علمی تشنگی کی سیری اور سیرابی کا اہتمام کر رہا ہوں۔ البتہ اگر میں دوسرے برتن کا منہ بھی کھول دوں تو میری گردن ماردی جائے گی۔ بعض لوگوں نے اس حدیث کو تصوّف کی طرف پھیر دیا' حالانکہ اس سے مراد یہی تھا کہ دین کا ایک پہلو تو وہ ہے کہ جو انفرادی زندگی ہے۔ نماز پڑھو' روزہ رکھو' تکبیر ہے' تسبیح وتحمید ہے' طہارت کے مسائل ہیں' زکوٰۃ کے قوانین ہیں۔ یہ تو وہ کام ہیں جو انسان کو کرنا ہی ہیں اور اس کے کرنے میں کوئی مانع نہیں ہوتا' کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بدترین حکومت بھی کبھی اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ غیروں کی حکومتیں آئی ہیں تو انہوں نے بھی ان پر قدغنیں

نہیں لگائیں۔ انگریز یہاں ۲۰۰ برس حکمرانی کر گیا‘ اس نے کبھی ان چیزوں میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں یا سکھا گردی کے دور میں مساجد کی بے حرمتی ضرور ہوئی ہے۔ یہ ہماری بادشاہی مسجد اصطبل بنی رہی ہے۔ انہوں نے اس درجے گری ہوئی حرکتیں بھی کی ہیں کہ مسجدوں کی سیڑھیوں پر قرآن مجید رکھے جاتے تھے اور ان کے اوپر خالصہ پاؤں رکھ کر جاتا تھا۔ وہ ایک بدترین دَور تھا‘ یوں سمجھیے کہ ایک عذاب تھا جو اس علاقے کے اوپر آیا۔ اسی لیے ’’سکھا گردی‘‘ اور ’’سکھا شاہی‘‘ ہمیشہ کے لیے محاورے کے الفاظ بن گئے۔ البتہ انگریز اتنے عرصے یہاں رہا ہے‘ لیکن اس نے کبھی نماز سے نہیں روکا۔ دین کا یہ حصہ دوام اور تسلسل کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ کوئی شخص چاہے نماز پڑھتا ہو یا نہ پڑھتا ہو‘ اسے معلوم ہے کہ دین میں نماز فرض ہے۔ پانچ نمازیں روزانہ پڑھنا فرض ہے۔ اس لیے کہ یہ معاملہ مسلسل نگاہ کے سامنے رہا ہے۔ وہ بابر کا دور ہو یا لودھی کا‘ یا وہ کوئی ہندو راجا ہو جس کے ہاں مسلمان بھی آباد رہے ہیں لیکن کہیں کسی نے دین کے اس حصے کو نہیں روکا۔ ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ گائے کے ذبیحہ کا معاملہ ہے کہ چونکہ یہ ہمارا مقدس حیوان ہے‘ گاؤ ماتا ہے اور ہمارے لیے دیوتا یا دیوی کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اس کو نہ ذبح کیا جائے۔ اس کے سوا دین کے اس حصے میں رکاوٹ نہیں آئی۔

دین کا وہ ایک حصہ جو ختم ہوا تھا وہ ہے حکومت و ریاست کا نظام اللہ کے احکام کے تابع ہو اور کسی کو کسی پر کوئی فوقیت حاصل نہ ہو ((كُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا))۔ تم سب برابر ہو‘ آپس میں بھائی بھائی ہو۔ تم میں کوئی حاکم و محکوم نہیں۔ ع ’’تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!‘‘ ((سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ)) تمہارے ہاں تو حاکم وہ ہوں گے جو لوگوں کے خادم ہوں گے۔ یہ نہیں کہ ان کے محل ہوں۔ ہمارے لیے تو آئیڈیل حکومت حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ کی ہے۔ اس اعتبار سے دورِ ملوکیت میں دین کا یہ پہلو اگر کوئی بیان کرتا تو ظاہر بات ہے اس کی گردن ماردی جاتی۔ اس کا تو مطلب ہے آپ عوام کو بادشاہت کے خلاف اُبھار رہے ہیں۔ آج ذرا یہ بات سعودی عرب میں کر کے دیکھیے‘ پتا ہی نہ چلے گا کہ آدمی کہاں گیا! اس کا وجود ہی نہیں رہے گا کہیں۔ اس لیے کہ یہ چیز

شہنشاہیت گوارا ہی نہیں کر سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نہ ہمارے بیان میں رہا نہ ہمارے تصور میں رہا‘ نہ ذہن میں رہا۔ ہوتے ہوتے اس درجے اوجھل ہوا ہے کہ ’’تکبیرِ ربّ‘‘ کے معنی ہی میں سے خارج ہو گیا کہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اللہ کی کبریائی کو نافذ کرو!

مُلّا کی اذاں اور‘ مجاہد کی اذاں اور!

میرے نزدیک یہ تینوں آیات اس اعتبار سے قرآن مجید کی اہم ترین آیات میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں کہ ان میں حضور ﷺ کا مشن‘ اس کی آخری منزل کہ کہاں تک جانا ہے اور شروع کہاں سے کرنا ہے‘ یہ دونوں چیزیں معیّن ہو گئی ہیں۔ اگر ایک خط کھینچنا ہے اور اس کے دو نقطے معیّن ہو جائیں تو بڑی آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ یہاں سے اسے شروع ہونا ہے اور یہاں تک اس کو لے کر جانا ہے۔ اب وہ سیدھا سواء السّبیل یا صراطِ مستقیم بن جائے گا۔ کارِ رسالت اور فریضۂ رسالت کا نقطۂ آغاز ’’انذار‘‘ ہے اور اس دُنیا کے اندر اس جدّوجُہد کی آخری منزل ’’تکبیرِ رب‘‘ ہے۔ وہ تکبیر شروع کہاں سے ہوگی؟ بندۂ مؤمن کے قلب میں‘ اس کے احساسات میں‘ اس کے شعور میں اللہ کی عظمت اور کبریائی کا نقش قائم ہو۔ یہ تکبیر ہے باطن میں۔ اس کے بعد اس کا اظہار و اعلان یعنی نعرۂ تکبیر بھی اس میں شامل ہے۔ ’’اللہ اکبر‘‘ ڈنکے کی چوٹ ہو۔ اس کا اعلان برملا ہو۔ اگر اس شعور کے ساتھ ہے‘ اس فہم کے ساتھ ہے تو ٹھیک‘ ورنہ تو انگریز کی چھاؤنیوں میں بھی اذانیں ہوتی تھیں لیکن اسے کوئی تشویش نہیں ہوتی تھی۔ انہیں بھی پتا تھا کہ مؤذن کو شعور ہی نہیں کہ مَیں کیا کہہ رہا ہوں۔ اگر اسے معلوم ہو تو وہ کلمۂ بغاوت ہے۔ اُس وقت بڑا تو انگریز تھا۔ قانون اُس کا‘ بالاتر اختیار اُس کا‘ باقی سب کچھ اُس کے نیچے تھا۔ مسلمان تو صرف اس پوزیشن میں تھے کہ وہ اپنے پرسنل لاء کے اندر نماز روزہ کر لیں‘ نکاح کے معاملات طے کر لیں‘ وغیرہ وغیرہ۔ باقی لاء آف دی لینڈ‘ فوجداری قانون‘ دیوانی قانون انگریز کا تھا۔ چنانچہ اصل میں تو ’’اکبر‘‘ وہ تھا‘ اللہ کہاں تھا! لیکن چونکہ مؤذن کو بھی اس امر کا شعور نہیں تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور یہ تو اعلانِ بغاوت ہے تو انگریز نے بھی پروا نہیں کی کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ علامہ اقبال کے وہ اشعار بڑے پیارے ہیں: ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور‘ مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور!

یہاں ’’مُلّا‘‘ کو روایتی مذہب سمجھیے جس میں صرف نماز‘ روزہ اور یہی چیزیں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی اذان دیتا ہے جبکہ ایک وہ مجاہد جو باطل کو للکارتا ہے‘ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آتا ہے وہ بھی اذان دیتا ہے۔ تو مُلّا کی اذاں اور ہے جبکہ مجاہد کی اذاں اور ہے۔

تکبیرِ ربّ درحقیقت کارِ رسالت یا فریضۂ رسالت کا ہدف ہے‘ اس کی آخری منزل ہے۔ ان تین آیات کو میرے نزدیک سیرت النبی ﷺ کے اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ سورۃ الصف کی مرکزی آیت:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۹﴾

درحقیقت اسی ’’رَبَّكَ فَكَبِّرْ‘‘ کی تشریح ہے اور اسی کی توضیح پر مشتمل ہے تو غلط نہ ہوگا‘ اس اصول کے عین مطابق کہ:

﴿الٓرٰ ۣ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝۱﴾
(ھود)

کہ یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کی آیات پہلے محکم کی گئیں‘ پختہ کی گئیں‘ پھر ان کی تفصیل بیان ہوئی ہے اس ہستی کی جانب سے جو علیم اور خبیر ہے۔

بَارَكَ اللّٰهُ لِي وَ لَكُمْ فِي الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ وَ نَفَعَنِيْ وَ اِيَّاكُمْ بِالْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ○○

(بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کا ۱۹۸۸ء کا ایک خطاب‘ جسے ترتیب و تدوین کے بعد پیش کیا گیا۔)

❁❁❁

اتحادِ اُمّت اور پاکستان کی سالمیت

شجاع الدین شیخ

آج پوری دنیا میں پائے جانے والے دو ارب مسلمان اور ۵۷ مسلم ممالک ہر طرح کی دولت اور وسائل سے مالا مال ہیں لیکن ان کی حیثیت یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا صہیونی ملک جسے چاہتا ہے ایک ایک کر کے تباہ و برباد کر رہا ہے اور مسلم ممالک میں سے کوئی بھی اس کا کچھ بگاڑ نہیں پا رہا۔ آج کل امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ ’’ابراہم اکارڈز‘‘ کی بات بڑے تواتر اور زور شور کے ساتھ کر رہے ہیں‘ جس پر عمل کا مقصد جنگ کے بغیر ہی مسلم ممالک کو فتح کر کے اسرائیل کے قدموں میں ڈالنا ہے۔ یہ قبلہ اوّل سمیت فلسطین پر ناجائز صہیونی قبضہ کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے جو کہ بحیثیت مسلمان اس امت کو کسی صورت بھی زیب نہیں دیتا۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو پاکستان کے اندرونی اور بیرونی حالات بھی انتہائی ناگفتہ بہ ہیں۔ ایک طرف امریکہ‘ اسرائیل اور بھارت کا شیطانی اتحادِ ثلاثہ پاکستان کو چاروں جانب سے گھیرنے اور تباہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور دوسری جانب اندرونی سطح پر سیاسی خلفشار‘ معاشی عدم استحکام‘ دہشت گردی اور اختلافات ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں امن و امان کی صورتِ حال اس وقت داؤ پر لگ چکی ہے۔ تیراہ اور باجوڑ کے علاقے میں خوف اور دہشت کا ماحول ہے۔ گویا پاکستان کی بقا اور سلامتی کو اندرونی اور بیرونی دونوں جانب سے سنگین خطرات لاحق ہیں۔

ہماری نظر میں اس ذلت و رسوائی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی ابدی ہدایت قرآن کریم کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ آج ہمارے حکمرانوں کو امریکہ کا اتنا خوف ہے کہ پانی کی ایک بوتل تک غزہ کے بھوکے پیاسے بچوں تک نہیں پہنچا سکتے لیکن ٹرمپ کو اربوں روپے کے تحائف دے رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب دنیا پر مسلمانوں کا غلبہ تھا۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

مسلمانوں کے دوبارہ غلبے اور اتحاد کی بنیاد اگر کچھ ہے تو وہ یہی قرآن ہے بشرطیکہ مسلمان اسے اللہ کی رسی سمجھ کر تھام لیں۔ اگر ہم قرآن کو تھامیں گے تو اللہ کے نبی ﷺ کا مشن بھی اِس اُمت کا مشن بنے گا۔

قارئین! یہ ملک ہم نے اللہ کے نام پر حاصل کیا تھا۔ لاکھوں لوگ ہجرت کر کے' اپنے گھر بار' کاروبار' روزگار اور جائیدادیں چھوڑ کر اس لیے نہیں آئے تھے کہ یہاں آ کر کاروبار کریں گے۔ یہ سب قربانیاں سود کے دھندوں' بے حیائی کے طوفان کے لیے نہیں دی گئی تھیں' بلکہ ان کے نزدیک اصل مشن اس مملکت خداداد میں شریعتِ محمدی کا نفاذ اور اللہ کے دین کا غلبہ تھا۔ تحریک پاکستان کا مقبول ترین نعرہ تھا: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!'' اس وقت اگر امریکہ' اسرائیل اور بھارت کا شیطانی اتحادِ ثلاثہ پاکستان کو کمزور کرنے کے درپے ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان کو معلوم ہے کہ یہ واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر بنا ہے اور یہ اسلام سے محبت کرنے والے لوگوں کا ملک ہے۔ اس لیے وہ اس ملک کو نقصان پہنچانے بلکہ خدانخواستہ تباہ کرنے کے لیے یہاں ہر طرح کا انتشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ کے بعد فتح کا جشن مناتے ہوئے اسرائیلی وزیراعظم بن گوریان نے کہا تھا کہ ''عرب ہمارے لیے خطرہ نہیں ہیں' ہمیں اصل خطرہ پاکستان سے ہے۔'' نیتن یاہو نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ مجھے خوشی ہوگی کہ پاکستان ایٹمی صلاحیت سے محروم ہو جائے۔ پاکستان کی سالمیت اور بقا کو آج بیرونی خطرات بھی لاحق ہیں۔ غزہ' لبنان' شام' یمن اور ایران کے بعد اگلا نشانہ پاکستان بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا آج اگر ہم اُمت کی سطح پر متحد نہیں ہوں گے تو پاکستان کی سالمیت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

اسی طرح پاکستان کی سالمیت کو اندرونی خطرات بھی لاحق ہیں۔ ایک طرف سیاسی جبر کا معاملہ ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ جمہوریت کی بجائے اس وقت ہائبرڈ سسٹم ملک پر مسلط ہے جو کہ ناکام ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح انسانی جسم کو زندہ رہنے کے لیے ہوا' پانی اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روح کی تازگی کے لیے ایمان کی ضرورت ہے۔ بالکل اسی طرح پاکستان کی سالمیت برقرار رکھنے کے لیے یہاں اسلام کے نفاذ کی ضرورت ہے جو اس کی بقا کے لیے بھی لازم ہے۔ جب تک شریعت اسلامی کا نفاذ نہیں ہوتا' جو ہمارا اصل ہدف ہے' تب تک اس ملک کو چلانے کے لیے کوئی نہ کوئی نظام تو چاہیے۔ ہمارے نزدیک مارشل لاء سے بہتر جمہوریت ہے تاکہ عوام آزادانہ رائے کے ذریعے اپنی حکومت بنا سکیں۔ وگرنہ عوام میں اضطراب اور مایوسی بڑھے گی' نفرتیں اور عداوتیں جنم لیں گی' نظریہ پاکستان سے دُوری پیدا ہو گی اور انتشار جنم لے گا۔ دین دشمن اور ملک دشمن طاقتیں تو یہی چاہتی ہیں کہ ملک میں انتشار پھیلے' عوام اور ریاستی اداروں کے درمیان تصادم کی کیفیت پیدا ہو اور ملک خانہ جنگی کا شکار ہو کر خدانخواستہ تباہ ہو جائے۔ ہماری حکومتوں اور ریاستی اداروں کو اس کا شعور ہونا چاہیے۔ لازم ہے کہ ہم اپنی غلطیوں کا اعتراف کریں اور اللہ کے حضور سچی توبہ کریں۔ یہ توبہ ہمیں اجتماعی سطح پر بھی کرنی ہوگی' کیونکہ ہم نے یہ ملک اسلام کے نام پر لیا تھا لیکن یہاں اسلام کو نافذ نہیں کیا۔ اپنے اس جرم کا بھی اعتراف کرتے ہوئے ہمیں اجتماعی توبہ کرنا ہوگی اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم یہاں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا نفاذ کریں۔ یہ ملک بنا بھی اسلام کے نام پر تھا اور اب اس کی بقا' سلامتی اور اس کا استحکام بھی نظامِ اسلام کے قیام پر ہی منحصر ہے۔

❁❁❁

بقیہ: عرضِ احوال

ساری دنیا میں کوئلے سے بجلی بنانے کے عمل کو جب ختم کیا جا رہا تھا تو پاکستان میں کوئلے سے بجلی بنانے کے پلانٹ نہ صرف لگائے جا رہے تھے بلکہ عوام کو بے وقوف سمجھ کر اس کے فوائد گنوائے جا رہے تھے۔

الغرض اِس وقت حالات کچھ ایسے ہیں کہ ایک خرابی کو دور کرنے کے لیے ایک اور خرابی پیدا کی جا رہی ہے۔ گویا انسان مسلسل خسارے کی طرف جا رہا ہے۔ بے شک یہ وہی خسارہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر کیا ہے۔ اس خسارے سے بچنے کے لیے نت نئی ٹیکنالوجی یا سائنس کی مدد ضرور لیں لیکن اصل حل کی طرف بھی توجہ دیں۔ اللہ تعالیٰ حکمرانوں' مقتدر حلقوں اور عوام سب کو ہر معاملہ میں دین سے رہنمائی لینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

خود احتسابی: زندہ قوموں کا شعار

حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَى الۡبَاطِلِ فَيَدۡمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ.....﴾

(الانبیاء:۱۸)

’’بلکہ ہم حق کو دے مارتے ہیں باطل پر تو وہ اُس کا بھیجا نکال دیتا ہے‘ تو جبھی وہ نیست ونابود ہو جاتا ہے .....‘‘

علامہ اقبال نے قرآن مجید کی اس آیت کو شعری قالب میں یوں ڈھالا ہے: ؎

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!

یعنی وہ قوم جو ہر دور میں اپنے عمل کا احتساب کرنے کی عادی ہو‘ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ایک شمشیر کی مانند ہے‘ جس کے ذریعے وہ دُنیا میں اپنی برتری اور حکمرانی کا سکّہ جماتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ باطل کا قلع قمع کرنے‘ اُسے نیست ونابود کرنے کے لیے ایسی قوم سے کام لیتا ہے جو سچائی کی عَلَم بردار ہو۔ ایسی قوم کا ایک اہم وصف علامہ اقبال کے نزدیک یہ ہے کہ وہ ہر دور اور ہر زمانے میں اپنے عمل کا حساب کرتی ہے‘ اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا تجزیہ کرتی ہے‘ اپنے حالات کو بصیرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اُن کی روشنی میں اپنے مستقبل کا لائحہ عمل طے کرتی ہے۔

ہم ہر سال یومِ آزادی مناتے ہیں۔ آزادی کی خوشی میں روایتی جوش وخروش کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر پروگرام اور سیمینارز وغیرہ منعقد ہوتے ہیں۔ میڈیا پر صدر‘ وزیر اعظم اور دوسرے حکومتی زعماء کے پیغامات نشر کیے جاتے ہیں۔ شہروں کو قومی پرچموں

اور جھنڈیوں سے سجایا جاتا ہے‘ اور بس! حالانکہ یومِ آزادی ہو‘ یومِ پاکستان ہو‘ یومِ دفاع ہو‘ مصورِ پاکستان کے حوالے سے یومِ اقبال ہو یا بانیٔ پاکستان کی ولادت و وفات کے تناظر میں یومِ قائد ہو‘ ان سب ایام کا اصل پیغام ’’خود احتسابی‘‘ ہے۔ اگر ہم اپنا احتساب کریں گے تو یہ ہماری قوم کے زندہ ہونے کی دلیل ہوگی‘ ورنہ ہمارا شمار زندہ قوموں میں نہیں ہوگا‘ چاہے ہم کتنی ہی شان وشوکت کے ساتھ یہ ایام منالیں۔

خود احتسابی کی اہمیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

((حَاسِبُوْا اَنْفُسَكُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا)) (سنن الترمذی)

’’تم اپنا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔‘‘

یہ حدیث ایک عمومی ہدایت ہے‘ جسے ہر فرد کو انفرادی طور پر بھی اپنے سامنے رکھنا چاہیے اور قوم کو اجتماعی طور پر بھی! اس کا مدعا یہ ہے کہ کل روزِ قیامت تمہارا محاسبہ ضرور ہوگا تو اس سے پہلے اپنا حساب خود کرو۔ خود احتسابی کی عادت ابھی سے ڈال لو‘ اس لیے کہ تم اس وقت امتحان کے کٹہرے میں ہو۔ تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ اگر تم احساس نہیں کرو گے تو سارا نقصان تمہارا ہوگا‘ اور تم اپنا مستقبل اور اپنی عاقبت برباد کر بیٹھو گے۔

خود احتسابی کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی قومی زندگی کا تنقیدی جائزہ لیں۔ اس بات پر غور کریں کہ جن مقاصد کے حصول کے لیے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا‘ اُن کے حصول کی ہم نے جِدّ وجُہد بھی کی یا انہیں بھلا دیا۔ پاکستان کے لیے جس منزل کا تعین کیا گیا تھا‘ اس کی جانب پیش رفت کی یا ہم اُلٹے پاؤں پھر گئے۔ ہم نے ہندوؤں سے الگ ’’قومیت‘‘ کی بنیاد پر علیحدہ ملک حاصل کیا تھا‘ نظریۂ پاکستان کی جان ’’اسلام‘‘ قرار پایا تھا‘ آزاد مسلمان سلطنت کا دستور ’’قرآنِ حکیم‘‘ بتایا گیا تھا‘ دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے اسلام کے ضابطۂ حیات کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اختیار کیا‘ اسے دنیا کے لیے مینارۂ نور کے طور پر پیش کیا یا نہیں! اِس پر سوچ بچار بہت ضروری ہے۔

پاکستان کو قائم ہوئے ساٹھ برس (اب ۷۸ برس) پورے ہو چکے ہیں۔ ہمیں بار بار خدائی عذاب کے جھٹکے لگ رہے ہیں۔ اب تو ہمیں ہوش میں آ جانا چاہیے‘ کچھ تو غور وفکر کرنا

چاہیے۔ ہمارے حکمرانوں‘ سیاست دانوں اور علماء کو اپنے اندر یہ اخلاقی جرأت پیدا کرنی چاہیے کہ اپنا احتساب کریں کہ آیا انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کیا ہے یا نہیں! عوام کو بھی اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ ان کی زندگی اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق بسر ہو رہی ہے یا اُس کے ضابطوں کے خلاف!

قیامِ پاکستان: معجزۂ خداوندی

ہم غور کرتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے وقت مسلمانانِ ہند کن حالات سے دوچار تھے‘ حصولِ پاکستان کا اصل مقصد کیا تھا اور وہ کیا محرکات اور حالات تھے جب برصغیر کی مسلمان قوم ایک جھنڈے تلے جمع ہوئی‘ اور ”پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ“ کا نعرہ بلند کیا۔

سورۃ الانفال کی آیت ۲۶ کا مضمون بالکل ان حالات کی عکاسی کرتا ہے جن حالات میں پاکستان قائم ہوا تھا۔ تحریکِ پاکستان کے زمانے میں مسلمانانِ ہند کے احوال کی اس آیت کے مضمون سے عجیب مشابہت ہے۔ فرمایا:

﴿وَاذۡکُرُوۡۤا اِذۡ اَنۡتُمۡ قَلِیۡلٌ مُّسۡتَضۡعَفُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ تَخَافُوۡنَ اَنۡ یَّتَخَطَّفَکُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىکُمۡ وَاَیَّدَکُمۡ بِنَصۡرِہٖ وَرَزَقَکُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۲۶﴾﴾

”اور یاد کرو جبکہ تم تھوڑی تعداد میں تھے اور زمین میں دبا لیے گئے تھے‘ تمہیں اندیشہ تھا کہ لوگ تمہیں اُچک لے جائیں گے‘ تو اللہ نے تمہیں پناہ کی جگہ دے دی اور تمہاری مدد کی اپنی خاص نصرت سے اور تمہیں بہترین پاکیزہ رزق عطا کیا‘ تاکہ تم شکر ادا کرو۔“

ہندوستان میں مسلمان تعداد میں انتہائی کم تھے‘ وہ مغلوب ہو گئے تھے اور اپنے ہی وطن میں بے بسی کا شکار تھے۔ ہندوستان کے قابض حکمران انگریز بھی مسلمانوں کے دشمن تھے۔ ان کی دشمنی کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کو‘ جو برصغیر پر حکومت کر رہے تھے‘ شکست دے کر یہاں کا اقتدار حاصل کیا تھا اور دوسری اور اصل وجۂ رقابت ان کی اسلام دشمنی تھی۔ یہود و نصاریٰ روزِ اوّل سے مسلمانوں اور ان کے دین کے دشمن ہیں۔ قرآن واضح طور پر بتا رہا ہے:

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡیَہُوۡدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوۡلِیَآءَ ۘ

بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ وَمَنۡ یَّتَوَلَّہُمۡ مِّنۡکُمۡ فَاِنَّہٗ مِنۡہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۱﴾﴾ (المائدۃ)

”اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دلی دوست (حمایتی اور پشت پناہ) نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور تم میں سے جو کوئی ان سے دلی دوستی رکھے گا تو وہ ان ہی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

الغرض‘ ہندوؤں اور انگریزوں نے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کو دبایا جا رہا تھا۔ تعلیم‘ سرکاری ملازمتوں‘ کاروبار اور تجارت میں ترقی کے دروازے اُن پر بند تھے اور ہندو روز افزوں ترقی کر رہے تھے۔ مسلمانوں کو اپنے قومی وجود اور اپنے علیحدہ تشخص کے مٹنے کا خطرہ تھا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ ہندو انہیں اُچک لے جائیں گے۔ اسلام کو اِس قدر شدید خطرہ لاحق تھا کہ برصغیر سے اُس کا نام و نشان مٹانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنانے کے لیے شدھی اور سنگھٹن جیسی انتہا پسند تحریکیں چل رہی تھیں۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو پناہ گاہ دی۔ پاکستان کی شکل میں ایک آزاد خطۂ زمین عطا فرمایا‘ وہ خطہ جس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا۔

پاکستان کا وجود میں آنا محال تھا۔ انگریز اور ہندو دونوں قیامِ پاکستان کے مخالف تھے اور مسلمان انتہائی کمزور تھے۔ اس کے علاوہ ایسے بیسیوں شواہد موجود ہیں کہ پاکستان ہرگز قائم نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے باوجود معجزانہ طور پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ خطۂ زمین عطا فرمایا اور انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے نجات عطا فرمائی‘ تاکہ ہم آزاد مملکت میں خلافت کا نظام قائم کریں‘ اسلامی اصولوں کی بنیاد پر نظامِ معیشت ترتیب دیں اور اپنی سماجی اقدار (social values) کو ترقی دیں۔

شکر کے بجائے کفرانِ نعمت کی روش

آزادی کی اس نعمتِ عظیمہ کی بنا پر ہم پر لازم تھا کہ اللہ ربّ العزت کا شکر بجا لاتے۔ شکر کا اوّلین تقاضا تو یہ تھا کہ ہماری انفرادی زندگی اس بات کی گواہی دیتی کہ ہم واقعتاً سچے مسلمان ہیں اور ہمارا طرزِ زندگی اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی کا نمونہ ہوتا۔ ہم ”اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ“ کی مثال بنتے‘ تاکہ دنیا ایک بندۂ مؤمن کا کردار ملاحظہ کرتی اور یہ دیکھتی کہ مؤمن کے نزدیک

اصل اہمیت اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی ہے۔ اس کی منزل دنیا نہیں‘ آخرت ہے۔

شکر کا دوسرا تقاضا یہ تھا کہ ہم اجتماعی سطح پر دین کو قائم کرتے‘ اسلام کے عدلِ اجتماعی کا کامل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرتے۔ وطن عزیز کو خلافت راشدہ کا نمونہ اور اسلام کے عالمی غلبے کی بنیاد بناتے۔ یہ نہ صرف ربّ العالمین کے شکر کا لازمی تقاضا تھا بلکہ ہمارا بنیادی دینی فریضہ بھی تھا۔ اِسی لیے بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی متعدد تقاریر میں اسلامی حکومت کی بات کی تھی۔ دستورِ پاکستان کے سوال پر انہوں نے دوٹوک کہا تھا: ’’ہمارا دستور قرآن ہوگا‘ جو چودہ سو سال پہلے ہمیں عطا کر دیا گیا ہے۔‘‘ اسلامی ریاست کے لیے ان کے سامنے آئیڈیل دورِ خلافتِ راشدہ کا تھا۔ مگر افسوس کہ ہم نے ناشکری کی اور انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر کفرانِ نعمت کی روش اپنائے رکھی۔

افراد کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو آج بحیثیتِ مجموعی معصیت‘ نافرمانی اور دین سے دوری کا چلن عام ہے۔ اگرچہ ہمارے معاشرے میں صاحبِ کردار لوگ بھی موجود ہیں‘ مگر اُن کی شرح بہت کم ہے۔ عام مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ دو ٹکے کا فائدہ نظر آئے تو اپنا ایمان بیچ دیتے ہیں۔ معاشرتی سطح پر اسلامی تعلیمات کی دھجیاں اُڑائی جا رہی ہیں۔ معاشی میدان میں ہم دوسروں کے حقوق غصب کرنے کے لیے قرآن کا جھوٹا حلف اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ دنیا پرستی اور مفاد پرستی کا زہر پورے معاشرے میں سرایت کر چکا ہے۔ عوام ہوں یا حکمران‘ سیاست دان ہوں یا علماء کا طبقہ‘ کوئی بھی اس سے محفوظ نہیں ہے۔ دین داری کے نام پر بھی دنیاداری ہو رہی ہے۔ اندریں حالات‘ جب تک ہم اپنے اعمال اور کردار کی اصلاح نہیں کرتے ہماری حالت تبدیل نہیں ہوگی۔

نظریۂ پاکستان سے انحراف

ہماری ناشکری کی انتہا یہ ہے کہ وہ نظریہ جس کی بنیاد پر ہم نے پاکستان حاصل کیا‘ اسی کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر دیے گئے۔ ہمارے نام نہاد دانشوروں نے قائداعظم کی گیارہ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ وہ ایک سیکولر ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ کس قدر ناانصافی کی بات ہے کہ ان کی سینکڑوں تقاریر کو جن میں اسلامی ریاست کی بات کی گئی تھی‘ پسِ پشت ڈال کر ایک مشتبہ بیان پر پورے گمراہ کن موقف کی بنیاد کھڑی کی جا رہی

ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر سیکولرازم ہی ہمارا آئیڈیل تھا تو پھر علیحدہ وطن کی تحریک چلانے اور ہندوستان کے بٹوارے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر تو اسی کا حصہ بن کر رہنا زیادہ فائدہ مند تھا کہ وہاں کم از کم جمہوریت تو ہے‘ جبکہ ہم تو یہاں صحیح معنوں میں جمہوریت بھی نہ لا سکے۔ انہوں نے تو جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر دیا جو ظلم کی بنیاد ہے‘ جبکہ ہم وہ بھی نہیں کر سکے۔

ہم نے نظریۂ پاکستان سے عملاً انحراف تو کیا ہی تھا‘ پستی کی انتہا یہ ہے کہ اب نظری طور پر بھی اُسے ختم کرنے کی مذموم کوششیں ہو رہی ہیں۔ اسے نصابِ تعلیم سے کھرچ دیا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ نظریۂ پاکستان کی زد ہندوؤں پر پڑتی ہے۔ یہ کہنا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں‘ رواداری کے خلاف ہے۔

پاکستان کا تعلیمی نصاب پہلے ہی قومی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ملک میں کئی قسم کے نصاب رائج ہیں۔ ہماری ایلیٹ کلاس کو جو نصاب پڑھایا جاتا ہے‘ اس کا نظریۂ پاکستان سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ وہ تو مغرب سے درآمد شدہ ہے۔ اِس طرح وہ کلاس جو روزِ اوّل سے پاکستان پر حکومت کرتی چلی آ رہی ہے‘ وہ تو پہلے سے ہی نظریۂ پاکستان اور دین و مذہب سے کاٹ دی گئی تھی۔ اب سرکاری سکولوں کے نصاب میں جو تھوڑا بہت نظریاتی پہلو تھا‘ اُسے بھی کھرچ دیا گیا۔ نصاب سے نظریۂ پاکستان کو خارج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گویا ہم اپنی پھانسی کے حکم نامے پر دستخط کر رہے ہیں اور پاکستان کی بنیادوں سے دست بردار ہو رہے ہیں۔

ہمارے ملک کے ممتاز دانشور فاروق حسن کچھ عرصہ پہلے ہندوستان کے دورے پر گئے۔ واپسی پر انہوں نے اپنے ایک مضمون میں جو بات لکھی‘ وہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہندو وکلاء برادری سے ملاقات کے دوران ہندوؤں نے مجھ سے سوال کیا کہ پاکستان بنا کر آپ نے کیا حاصل کیا‘ وہ کون سی چیز ہے جو آپ اسلام اور مذہب کے حوالے سے پاکستان میں لے آئے اور انڈیا میں موجود نہیں ہے۔ مذہبی آزادی جو پاکستان میں ہے وہ یہاں بھی ہے۔ کیا یہاں (انڈیا میں) مسجدیں نہیں ہیں‘ اذانیں نہیں ہوتیں‘ لوگ نماز نہیں پڑھتے‘ روزے نہیں رکھتے‘ زکوٰۃ نہیں دیتے۔ بتائیے‘ پاکستان اور انڈیا میں کون سا فرق ہوا؟ فاروق حسن صاحب کہتے ہیں کہ میں بالکل لاجواب ہو گیا۔ اِس واقعہ میں ہمارے لیے غور وفکر کا بہت سا سامان ہے۔ (واضح رہے کہ یہ خطاب ۲۰۰۷ء کا ہے۔) ہمارے ان لوگوں کو شرم آنی

چاہیے جو یہ کہتے ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر نہیں بنا تھا۔ یہ آزادی کی ناقدری اور کفرانِ نعمت کی انتہا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم نظریۂ پاکستان کو مضبوط کرتے ہم نے اس کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر دیے۔ افسوس کہ ہمیں ''اوپر'' سے جو حکم ملا ہے' اُس کی بجا آوری کے لیے ہم نظریۂ پاکستان کو اپنی ہی چھری سے ذبح کر رہے اور پاکستان کی بنیاد ہی کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!

روشن خیالی کے نام پر دینی اقدار سے دوری

نصابی تبدیلیوں کے علاوہ نام نہاد ''روشن خیالی'' کے گمراہ کن نعرہ کے تحت پورے معاشرہ سے دینی اقدار مٹائی جارہی ہیں اور خاص طور پر سُنّتِ رسول ﷺ اور اُسوۂ رسولؐ کے تصوّرات کو بالکل ہی خارج کیا جارہا ہے۔ روشن خیالی کے نام پر اسلام کا جو تصوّر مغرب دے رہا ہے' اس کو عام کیا جارہا ہے۔ نصاب میں دین اور دینی اقدار کا ''سافٹ'' امیج پیدا کیا جارہا ہے۔ جو دین ہمیں نبی اکرم ﷺ نے دیا تھا' گویا اسے ہم مسترد کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہمیں وہ ''دین'' گوارا ہے جو یورپ سے آرہا ہے۔ یہ خیال عام کیا جارہا ہے کہ اسلام تو بس ''روشن خیالی'' اور رواداری کا نام ہے اور قرآن مجید کی آیات کی غلط تاویلات کی جارہی ہیں۔

خود بدلتے نہیں' قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

اِس گمراہی کے پس پردہ خطرناک سازش کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ (معاذ اللہ!) دینِ مصطفی ﷺ ہمیں قبول نہیں' حالانکہ اللہ کے نزدیک دین وہی معتبر ہے جس کی تعبیر کا حق صرف حضور اکرم ﷺ کو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح طور پر فرمادیا کہ میرے محبوب ﷺ کی اطاعت ہی میری اطاعت ہے:

﴿مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنۡ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ عَلَيۡهِمۡ حَفِيۡظًا ۝٨٠﴾ (النساء)

''جس نے اطاعت کی رسول (ﷺ) کی اُس نے اطاعت کی اللہ کی۔ اور جس نے

روگردانی کی تو ہم نے آپ کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا ہے۔''

برصغیر پاک وہند میں ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اکبر کے دینِ الٰہی کی کوشش بھی اُس دور کی ''روشن خیالی'' تھی اور اس کا عنوان بھی رواداری تھا۔ دین الٰہی کے پس پردہ یہی سوچ کارفرما تھی کہ مذاہب کی تفریق ختم کر کے سب کو ایک کر دیا جائے۔ آخر ہندو بھی بھگوان کو مانتے ہیں' عیسائی اور یہودی بھی اللہ کو مانتے ہیں۔ بدھ مت میں بھی کوئی تصوّرِ خدا ہے۔ کیوں نہ ایسا ہو کہ تمام مذاہب کی چیدہ چیدہ تعلیمات لے کر دین کا معجون تیار کیا جائے' جو سب مذاہب کے لیے قابلِ قبول ہو۔

یہ واضح ہے کہ ''اعتدال پسندی'' کے تناظر میں جو نیا تصوّرِ اسلام مسلط کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں' یہ اسلام وہ دین خالص نہیں جس کو رسول اللہ ﷺ خدا سے لے کر تشریف لائے' بلکہ یہ اصل میں ''دینِ امریکہ'' ہے اور اس کو پروموٹ کرنے کا شرف آج مغل بادشاہ اکبر کی بجائے فوجی ''بادشاہ'' پرویز مشرف کو حاصل ہے۔ پھر جیسے اکبر کو اپنے باطل افکار کی تائید اور ترویج کے لیے ابوالفضل اور فیضی جیسے بڑے بڑے مفاد پرست دانشور اور نام نہاد علماء وفضلاء مل گئے تھے' اسی طرح ہمارے صدر صاحب کے افکار کو بھی بہت سے متجددانہ سوچ رکھنے والے عقل گزیدہ دانشور اور سکالرز سندِ جواز عطا کر رہے ہیں۔

پاکستان پر عذابِ الٰہی کے کوڑے

ہماری سیاہ کاریوں اور کفرانِ نعمت کے سبب ۱۹۷۱ء میں خدا کے عذاب کا ایک کوڑا ہم پر برسا۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ہمارا مشرقی بازو ہم سے جدا ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔ پاکستانی قوم اور فوج کو بدترین ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ سقوطِ ڈھاکہ خواب سے بیدار ہونے کا موقع تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم نظریۂ پاکستان کی طرف پلٹتے' اللہ اور اس کے دین کی طرف رجوع کرتے' خود احتسابی کی نظر سے اپنا جائزہ لیتے' اصلاحِ عمل کے لیے کمربستہ ہو جاتے۔ لیکن ہم نہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوئے' نہ ہی ہم نے اپنی روش تبدیل کی اور سقوطِ ڈھاکہ کے عظیم سانحہ اور خدائی جھٹکے کو بھی ہم نے بھلا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی سُنّت کے مطابق ہمیں مہلت دی۔ جنگ وجدل کا دور ختم ہوگیا' حالات موافق ہوگئے' ہمیں ترقی عطا فرمائی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں ایٹمی صلاحیت سے بھی نواز دیا

جو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت و تائید کا ایک بہت بڑا مظہر تھا۔عموماً پاکستان کا شمار تو دنیا کے پس ماندہ ترین ممالک میں ہوتا ہے‘ جہاں علم وتحقیق اور ریسرچ کے معیار کا یہ حال ہے کہ دنیا کے کئی ممالک میں اُسے accept ہی نہیں کیا جاتا۔گویا سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے ہم اس قابل نہیں تھے کہ ہمیں ایٹمی ٹیکنالوجی ملتی‘ مگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایٹمی صلاحیت مرحمت فرمائی تو یہ اس کا خصوصی فضل تھا‘ لیکن ہم نے اس کی بھی کوئی قدر نہیں کی۔

اپنے اصل مقاصد اور اہداف سے پسپائی میں اب تو اور بھی تیزی آ گئی ہے۔اسلام اور دینی اقدار سے قوم کو دور کیا جا رہا ہے۔’’یہود‘ نصاریٰ اور ہنود‘‘ یا ’’اسرائیل‘ امریکہ اور بھارت‘‘ تینوں کی شیطانی تثلیث‘ جو پاکستان کے وجود کو مٹانے کے درپے ہے‘ کے دباؤ کے نتیجے میں ہم حقیقی اسلام سے منہ موڑ کر روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے راگ الاپنے لگے ہیں۔ہم دشمنانِ دین کو باور کرا رہے ہیں کہ اسلام کی جو تعبیر تمہیں پسند ہے‘ اسے اختیار کریں گے۔قرآن حکیم اور سُنّتِ رسولؐ پر مبنی اسلام کی بجائے تمہارے افکار و نظریات کی کوکھ سے جنم لینے والی ’’روشن خیالی‘‘ کو اسلام کا لبادہ پہنائیں گے۔کہا جا رہا ہے کہ ہم اسلام کا سافٹ امیج پیش کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسلام میں اس کی گنجائش کہاں ہے؟ اگر سافٹ امیج اور روشن خیالی اسی کا نام ہے کہ اسلام کے اصولوں سے انحراف کر کے اغیار کے ’’Certified Islam‘‘ کو اپنا لیا جائے تو اُسے دجل وفریب اور ابلیسیت کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

باطل دوئی پسند ہے‘ حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

تھوڑا عرصہ پہلے آنے والے زلزلہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں غور وفکر اور خود احتسابی کا ایک اور موقع دیا ہے۔یہ سوال بہت اہم ہے کہ اتنا ہولناک زلزلہ کیوں آیا؟ اگر اب بھی ہم اپنا محاسبہ کر لیں‘ اسلام کی طرف مراجعت کریں‘ نظریۂ پاکستان کی جانب پیش قدمی کریں تو پاکستان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ضروری ہے کہ سب سے پہلے حکمران طبقہ اپنی سوچ کی اصلاح کرے۔ اپنی سابقہ کوتاہیوں پر نادم ہو کر حصولِ پاکستان کے اصل مقاصد کی جانب پیش قدمی کرے۔ اس کے بعد قوم کو بیدار کیا جائے‘ انہیں آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے گناہوں سے معافی مانگیں‘ اللہ کی اطاعت کا عہد کریں۔اگر ایسا ہو جائے تو یہ بہت بڑا ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہو سکتا ہے۔

کیا پاکستان آزاد ہے؟

یہ تو تھی داخلی صورتِ حال‘ اب ایک نظر خارجہ پالیسی پر ڈالتے ہیں۔اس وقت حالات کے تیور یہ بتا رہے ہیں کہ ابلیسی قوتیں ایک شیطانی مثلث کی شکل میں پاکستان کے گرد گھیرا تنگ کر رہی ہیں۔ان کا سرخیل تو امریکہ ہے‘ لیکن اُس کی ڈور ہلانے والی اصل قوت اور ماسٹر مائنڈ اسرائیل (یہود) ہے۔کسی زمانے میں یہ بات ایک انکشاف ہوا کرتی تھی‘ اب یہ راز نہیں بلکہ کھلی حقیقت ہے‘ جسے ہر شخص جانتا ہے۔تیسری قوت ہنود ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تینوں قوتیں مل کر پاکستان اور اسلام کو مٹانے کے درپے ہیں۔بحالاتِ موجودہ کوئی احمق ہی ہوگا جو یہ سمجھتا ہو کہ امریکہ کی ’’نظرِ بد‘‘ ہمارے ایٹمی پروگرام پر نہیں ہے اور وہ اس کو ختم نہیں کرنا چاہتا ہے۔باخبر حلقے جانتے ہیں کہ امریکہ کا اصل ٹارگٹ پاکستان ہے۔کیا امریکی ناظم الامور رابرٹ او بلیک کے بیان کے بعد بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلیں گی؟ انہوں نے دوٹوک لفظوں میں کہا ہے کہ ہم بھارت کے ساتھ مل کر کسی تیسرے ملک کے خلاف مشترکہ فوجی آپریشن کر سکتے ہیں۔یہ تیسرا ملک کون سا ہے‘ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔اس سے پہلے کنڈولیزا رائس جب پاکستان اور بھارت کا دورہ کر کے امریکہ واپس گئی تھیں تو ان کا یہ چشم کشا بیان سامنے آیا تھا کہ ’’پاکستان کے مستقبل کا فیصلہ امریکہ اور بھارت مل کر کریں گے‘‘۔یہ ہے ہماری آزادی!

ایک طرف دشمنوں کے پے در پے گھناؤنے بیانات اور سازشیں ہیں اور دوسری جانب ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ان قوتوں کی چاپلوسی کرنے اور ان کی رضا جوئی حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ان کی خوشنودی کے لیے اپنی آزادی‘ خودمختاری اور اسلامی تشخص کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لیے پیٹ میں مروڑ اُٹھ رہے ہیں۔

یہ صورتِ حال پوری قوم‘ بالخصوص کالج و یونیورسٹیوں میں پڑھے ہوئے لوگوں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ اُن افراد کے لیے لمحہ فکریہ ہے جو بڑے جوش وخروش کے ساتھ یومِ آزادی مناتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ فی الواقع پاکستان آزاد ہے‘ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ہم نے اپنی حقیقی آزادی کو مستحکم نہیں کیا‘ گنوایا ہے۔وہ یہ نہیں سوچتے کہ یہ کیسی آزادی ہے کہ ہم نہ سیاسی طور پر آزاد ہیں اور نہ دینی اور مذہبی طور پر۔ہم نے غلط فہمیوں کی جو پٹیاں اپنی آنکھوں پر باندھی ہوئی ہیں اب انہیں اتارنے کا وقت آ چکا ہے۔علامہ اقبال نے ایک موقع پر

''مُلّا'' کے محدود تصوّرِ دین پر جو پھبتی کسی تھی' وہ آج ان لوگوں پر صادق آتی ہے۔

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

اِن حالات میں ہم اپنے آپ کو آزاد کیسے کہہ سکتے ہیں جبکہ مذہب اور دین کے معاملے میں بھی ہم پر امریکہ کی مرضی ٹھونسی جا رہی ہے اور ہمارے سیاسی نظام کی پشت پر بھی امریکہ سوار ہے۔ دراصل یہ اہلِ پاکستان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ہے کہ ہمیں حقیقی آزادی سے محروم کیا جا چکا ہے۔ ہمارے پاس کوئی مینڈیٹ اور اختیار نہیں ہے۔ ہمارا کوئی بھی فیصلہ جو امریکہ چاہتا ہے ''اوپر'' ہی ہو جاتا ہے۔ ہم آزاد شہریوں کو کوئی حق حاصل نہیں کہ حکومت سے پوچھ سکیں کہ قوم کے ساتھ جو واردات ہو رہی ہے' کیوں ہو رہی ہے۔ ہماری اسمبلی کو بھی اختیار نہیں کہ وہ ''اوپری'' فیصلوں پر بحث کرے۔ دراصل ہم نے اپنے مالک سے بغاوت کر رکھی ہے۔ ہم نے کبھی اللہ پر اعتماد نہیں کیا بلکہ ہمیشہ شیطانی قوتوں پر بھروسا کیا۔ امریکہ کے گھڑے کی مچھلی بن کر اس کی خوشنودی کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار رہے' لیکن اللہ کی خوشنودی کے لیے ایک قدم اٹھانے کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔

بتوں سے تجھ کو اُمیدیں' خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

اگر ان حالات میں جبکہ ہمارے خلاف سازشوں کے جال بُنے جا رہے ہیں' ہم امریکہ سے کسی قسم کا تعاون کرتے ہیں یا اس سے خیر کی توقع رکھتے ہیں تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری پوری قوم میں ہمت' مردانگی اور غیرت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ گویا وہ جو چاہیں' ہم سے مطالبہ کریں' ہم اُسے پورا کرنے کے لیے آمادہ اور تیار ہیں۔ یہ ذہنی اور فکری پستی آزاد قوموں کا شعار نہیں ہے' خاص طور پر مسلمانوں اور مومنوں کو یہ روش زیب نہیں دیتی۔

نائن الیون کے بعد پاک افغان پالیسی

نائن الیون کے بعد ہم نے جو طرزِ عمل اختیار کیا' افغان پالیسی کے حوالے سے یوٹرن لیا' وہ بھی اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور پرویز مشرف صاحب بھی اس پر بہت فخر کرتے ہیں کہ میں مسلمان اور سیّد زادہ ہوں' تو مسلمان کے لیے اصل رہنمائی کا ذریعہ

قرآن وسُنّت اور سیرتِ رسولؐ ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس جنگ میں امریکہ کا ساتھ دیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ ہم مجبور تھے' کیونکہ امریکہ کا ٹارگٹ افغانستان کے ساتھ ساتھ پاکستان بھی تھا۔ امریکہ بہت بڑا اتحاد بنا کر آیا تھا اور اس وقت ہمیں دھمکی دی گئی تھی کہ ہمارا ساتھ دو' ورنہ پتھر کے زمانہ میں دھکیل دیے جاؤ گے۔ چنانچہ جنرل مشرف نے جو کیا ٹھیک کیا' ورنہ افغانستان کے ساتھ ساتھ ہمارا ملک بھی تورا بورا بن جاتا۔ ہمارے اندر اتنی سکت نہیں تھی کہ دنیا کی سپر پاور کا اپنے محدود وسائل اور جنگی اسلحہ کے ساتھ مقابلہ کرتے۔ اس رائے کے حاملین یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ اسلام کے عسکری اصول یہ اجازت نہیں دیتے کہ طاقت کا اس قدر عدم توازن ہو' پھر بھی آپ دُشمن کے مقابلے پر کھڑے ہو جائیں۔

بعض نام نہاد سکالرز امریکہ سے تعاون کے لیے صلح حدیبیہ کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس صلح سے پتہ چلتا ہے کہ مصلحت کے تحت کبھی دب کر بھی صلح کر لینی چاہیے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس بارے میں صلح حدیبیہ کا حوالہ دینا تو صریحاً غلط ہے کیونکہ صلح حدیبیہ جب ہو رہی تھی تب مسلمان دبے ہوئے نہیں تھے' بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ سیرت کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ صلح کا پیغام لے کر تو کُفّار آئے تھے۔ چودہ سو مسلمان جو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نکلے تھے' انہوں نے احرام باندھا ہوا تھا اور ہر ایک کے ہاتھ میں تلوار تھی' اگرچہ نیاموں کے اندر تھی۔ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت (رضوان) کی۔ انہوں نے عہد کیا کہ ہم یہاں سے تب تک نہیں ہلیں گے جب تک کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ نہ لے لیں' چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں۔ اِسی لیے اس بیعت کو بیعت علی الموت بھی کہا جاتا ہے۔ جب کفار کو اس کا علم ہوا تو انہیں اپنی موت نظر آنے لگی اور وہ صلح کا پیغام لے کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اگرچہ صلح کی بعض شقیں ایسی تھیں جو بظاہر کُفّار کی favour میں تھیں مگر نبی کریم ﷺ نے اپنی فراست کی بنیاد پر انہیں تسلیم کر لیا۔ اس سے مسلمانوں میں ایک خلجان بھی پیدا ہوا اور بے چینی بھی مگر یہ بات طے شدہ ہے اور قرآن حکیم کی سورۃ الفتح سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہ صلح دب کر نہیں ہوئی۔ صلح حدیبیہ کے برعکس یہاں صورتِ حال مختلف تھی۔ ہم تو مغلوب ہیں' ہم صلح کیا کرتے' ہم تو امریکہ کا ہر مطالبہ ماننے کے لیے تیار ہو گئے۔ بھلا یہ کون

سی صلح ہے؟ ہماری مغلوبانہ پالیسیوں کی صلح حدیبیہ سے کیا نسبت؟

جہاں تک طاقت کے عدمِ توازن کی صورت میں مقابلہ نہ کرنے والی بات کا تعلق ہے تو یقیناً یہ بات درست ہے، لیکن طاقت کے توازن کو تب دیکھا جائے گا جب مسلمانوں نے خود کسی دشمن ملک پر حملہ کرنا ہو یا کُفّار کے اوپر چڑھائی کرنی ہو، لیکن یہاں صورت یہ نہیں تھی۔ آپ کسی ملک پر حملہ نہیں کر رہے تھے بلکہ ایک طاقت آپ کو دھمکیاں دے رہی تھی، آپ نے تو کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی، خطرہ تو ان کی طرف سے تھا۔ سیرت میں اس صورتِ حال کی مطابقت غزوۂ احزاب سے ہے۔ اِس غزوہ میں عرب کی تمام طاقتیں مجتمع ہو گئیں اور انہوں نے مدینہ کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ دنیاوی حساب کتاب کے اعتبار سے مسلمانوں کا خاتمہ اور تباہی یقینی تھی۔ جیسے ہمارے ہاں طاقت کا کوئی توازن نہیں تھا، وہاں بھی یہی صورتِ حال تھی۔ اس وقت مدینہ میں جو لوگ لڑنے کے قابل تھے ان کی تعداد بمشکل تین ہزار تھی۔ ان میں بھی اچھی خاصی تعداد منافقین کی تھی جن کے بارے میں اندیشہ تھا کہ عین وقت پر آستین کے سانپ ثابت ہوں گے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں کُفّار کی تعداد بارہ ہزار سے چوبیس ہزار تک تھی۔ کثرتِ تعداد کے علاوہ ان کا اسلحہ ان کی جنگی تیاریاں اور جنگی وسائل بھی مسلمانوں سے بہت زیادہ تھے۔

مؤمنانہ اور منافقانہ کردار

اس انتہائی مشکل صورتِ حال میں منافقین اور مومنین کا جو کردار اور طرزِ عمل سامنے آیا، قرآن حکیم نے اُس کو واضح کیا ہے۔ اِس حالت میں منافقین کا نفاق ظاہر ہو گیا۔ اُن کی کیفیت یہ تھی جیسے موت کے وقت مرنے والے کی آنکھوں میں دہشت اور خوف ہوتا ہے۔ اُن کی زبان پر وہ الفاظ آ گئے، جو قرآن حکیم نے نقل کیے ہیں:

﴿وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾﴾ (الاحزاب)

’’اور جب کہہ رہے تھے منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا کہ نہیں وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ اور اُس کے رسولؐ نے مگر دھوکے کا۔‘‘

منافقین کہنے لگے کہ ہم سے وعدے کیے گئے تھے کہ قیصر و کسریٰ کی حکومتیں تمہارے قدموں میں ہوں گی اور اس وقت کیفیت یہ ہے کہ ہم رفع حاجت کے لیے باہر نہیں نکل سکتے۔

اِس کے برعکس مؤمنین صادقین نے عظمتِ کردار کا مظاہرہ کیا۔ سچے اہلِ ایمان جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو پیشگی خبردار کر دیا تھا کہ اس راہ میں آزمائشیں اور امتحانات آئیں گے۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ﴿۲۲﴾﴾

’’اور جب اہلِ ایمان نے دیکھا اُن لشکروں کو تو انہوں نے کہا کہ یہی تو ہے جس کا ہم سے وعدہ کیا تھا اللہ اور اُس کے رسولؐ نے، اور بالکل سچ فرمایا تھا اللہ اور اُس کے رسولؐ نے۔ اور اس (واقعہ) نے ان میں کسی بھی شے کا اضافہ نہیں کیا مگر ایمان اور فرماں برداری کا۔‘‘

اس غزوہ کے مشکل حالات سخت آزمائش تھے۔ اس آزمائش سے واضح ہو گیا کہ کون سچا مؤمن ہے جو اللہ پر توکّل کرنے والا اور آزمائش کا مردانہ وار مقابلہ کرنے والا ہے، اور کون ہے جو محض ایمان کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر کوئی شخص ایمان کے لاکھ دعوے کرے، لیکن اس کا توکّل اللہ پر نہ ہو، بلکہ تمام تر بھروسا محض ظاہری اسباب پر ہو تو وہ حقیقی ایمان سے محروم ہے، خواہ وہ کتنا بڑا مسلمان بنا پھرتا ہو۔ چنانچہ قرآن مجید کا یہی وہ مقام ہے جہاں رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کو اُسوۂ حسنہ کے طور پر اُجاگر فرمایا گیا کہ سچے اہلِ ایمان کے لیے رول ماڈل نبی اکرم ﷺ کی شخصیت اور آپؐ کا طرزِ عمل ہے۔ غزوۂ احزاب میں دشمن کے بے پناہ دباؤ کے باوجود آپؐ نے اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنا گوارا نہیں کیا بلکہ اللہ ربّ العالمین پر توکّل کرتے ہوئے پوری پامردی کے ساتھ دشمن کی افواج کے سامنے ڈٹ جانے کا سبق اُمّت کو سکھایا۔

اپنا طرزِ عمل پہچانیے

غزوۂ احزاب کے آئینے میں ہم اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں کہ ہم نے کون سی روش اختیار کی: منافقین کی یا مومنین صادقین کی؟ ذرا سوچیے، امریکی دھمکیوں کے بعد ہمیں بھی اپنی موت نظر آ رہی تھی، تباہی یقینی دکھائی دیتی تھی، تورا بورا ہونے کا خطرہ تھا۔ ہم نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا کہ دشمن نے جو بھی مطالبہ کیا، ہم نے اُسے من وعن مان لیا۔ جنرل ٹومی فرینکس نے اپنی کتاب میں

اس بات کا اعتراف ہی نہیں کیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم پر الزام دیا ہے کہ جنرل پرویز مشرف کے سامنے امریکہ نے جتنے مطالبے رکھے‘ خیال تھا کہ ان میں سے کچھ مان جائیں گے اور کچھ تسلیم نہیں کریں گے‘ لیکن انہوں نے سب کے سب مطالبے مان لیے۔

طالبان کے خلاف یوٹرن لینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ طالبان حکومت کوئی عام حکومت نہیں تھی‘ بلکہ وہ ایسی نظریاتی حکومت تھی جو کُرۂ ارض پر بسنے والے ایک ارب مسلمانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے چلی تھی۔ شریعت کا نفاذ اس کا مشن تھا‘ تاکہ زمین پر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی شریعت کی بالادستی ہو۔ وہ واحد حکومت تھی جس کا رُخ اللہ کی طرف تھا۔ ہم نے اس کے خاتمے اور اسلام کے عظیم مجاہدین کو ذبح کرنے میں امریکہ کا ساتھ دیا اور ڈھٹائی کی انتہا یہ ہے کہ اس پر فخر کا اظہار بھی کرتے ہیں‘ حالانکہ اسلامی حکومت کے خلاف امریکہ کی حمایت اللہ کے غضب کو بھڑکانے والی جسارت تھی۔

اِس یوٹرن کے بعد نظریۂ پاکستان سے ہی منحرف ہو گئے۔ بعدازاں جہادِ کشمیر کے موقف سے پسپائی اختیار کی۔ وہ جہاد جس کو شروع شروع میں جنرل مشرف نے بہت سپورٹ کیا تھا‘ اور قابلِ تحسین موقف اپنایا تھا کہ یہ جہادِ آزادی ہے‘ حریت پسند اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں لیکن جب امریکہ بہادر کی طرف سے کہا گیا کہ یہ دہشت گردی ہے تو ہم نے بھی کہہ دیا آمَنَّا وَصَدَّقْنَا اور جہادی تنظیموں پر پابندی لگادی۔

اب امریکی ہدایت پر مدارس کے خلاف یلغار کی جا رہی ہے۔ لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں ہزاروں طلبہ و طالبات کے خلاف بہیمانہ کارروائی اِس کا بدترین مظہر ہے۔ نفاذِ اسلام‘ بے حیائی اور عریانی کے خاتمے اور گرائی گئی مساجد کی دوبارہ تعمیر کے جائز مطالبات کو طاقت سے دبا دیا گیا اور ریاستی طاقت استعمال کر کے معصوم طلبہ وطالبات کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔

ان رسواکن اقدامات کے باوجود امریکہ کی جانب سے "Do more" کا تقاضا کیا جا رہا ہے۔ قبائلی علاقوں میں آپریشن کے ’احکام‘ دیے جا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ خود کارروائی کرنے کی دھمکی بھی دی جا رہی ہے۔

پس چہ باید کرد...

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو امریکی چنگل سے باہر نکالیں۔ خارجی طور پر صاف

کہہ دیا جائے کہ ہمارے نزدیک اللہ اور رسول ﷺ کا حکم مقدم ہے۔ ہم مزید دباؤ برداشت نہیں کریں گے۔ اگر ہم نے اب بھی ماضی کی طرح تورابورا بننے کے اندیشہ سے ’’بڑی طاقت‘‘ کی اطاعت گزاری اور اللہ کی بغاوت کا شیوہ اپنائے رکھا تو یاد رکھیے‘ بادشاہ حقیقی کے پاس کسی خطۂ زمین کو تورابورا بنانے کے بے شمار طریقے ہیں۔ وہ آنِ واحد میں پورے ملک کو تورابورا بنا سکتا ہے۔ ؎

نہ جا اُس کے تحمل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اُس کی
ڈر اُس کی دیرگیری سے کہ ہے سخت انتقام اُس کا!

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں انفرادی اور اجتماعی سطح پر خوداحتسابی اور توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!!

(۲۰۰۷ء میں کیے گئے تین خطاباتِ جمعہ کا خلاصہ)

❁❁❁

بقیہ: تکبّر اور اُس کا علاج

جس وقت آدمی یہ تصوّر کرے گا تو ان شاءاللہ‘ تکبّر کی جڑ کٹ جائے گی۔ اپنے آپ کو ناکارہ اور ناچیز کہنا تواضع نہیں بلکہ ناکارہ سمجھنا تواضع ہے۔ حقیقی متواضع شخص تکلفاً اپنی تحقیر نہیں کرتا لیکن دل میں ہر وقت اپنے عیوب پر نظر رکھتا ہے۔ بقول بہادر شاہ ظفر ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر‘ رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا!

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں حقیقی معنوں میں تواضع کی دولت عطا فرمائے۔ تکبر‘ حُبِ جاہ اور فخر جیسے مہلک امراض سے بچنے کی کامل توفیق عطا فرمائے کہ ہر دم‘ ہر آن اُس ربّ کائنات کا شکر بجالائیں۔ آمین یا ربّ العالمین!

❁❁❁

اسلام‘ جمہوریت اور پاکستان

ایوب بیگ مرزا

انگریز کے ہندوستان پر قبضہ سے ہندو کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا‘ اس لیے کہ پہلے اُن پر مسلمان حکمران تھے اب انگریز حکمران بن گئے۔ گویا حکمران بدل گئے۔ ہندو پہلے مسلمانوں کی رعیت تھے‘ اب انگریز کی رعیت بن گئے۔ لہٰذا اُن کی سیاسی وسماجی حیثیت بالکل متاثر نہ ہوئی جبکہ مسلمان جو پہلے حکمران تھے‘ اب وہ انگریز کے محکوم ہو گئے۔ حکمرانی بھی ختم ہوئی اور آزادی بھی غلامی میں تبدیل ہوگئی۔ گویا مسلمانانِ ہند پر تو آسمان ہی گر پڑا۔ مسلمانانِ ہند کی عظیم اکثریت اس تبدیلی کو ذہنی اور قلبی طور پر قبول نہ کر پائی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اُن کے کردار اور افعال سے اس صورت حال کی عدم قبولیت کا اظہار ہوتا رہا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی جسے انگریز نے غدر کا نام دیا تھا‘ اُس میں حقیقی اور کلیدی کردار مسلمانوں ہی کا تھا۔ آزادی کی اس جنگ میں سکھوں نے کسی حد تک حصہ لیا لیکن ہندو کہیں نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ اِس ناکام جدّوجُہد کے بعد انگریز نے مسلمانوں کو بدترین انتقام کا نشانہ بنایا جبکہ ہندو کو خوب نوازا۔ اِن انتقامی کارروائیوں کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت دب گئی اور ایک خاصی بڑی تعداد نے حالات سے سمجھوتا کر کے انگریز کی غلامی کو کم از کم وقتی طور پر قبول کر لیا۔ یہ لوگ بھی ہندو کی طرح انگریز کی چاپلوسی کرنے لگے اور اُس کی اطاعت کو فریضہ جان لیا۔ اُدھر جب یورپ میں جمہوریت کا طوطی بولنے لگا تو ہندو کو اس میں اُمید کی کرن نظر آئی اور ۱۸۸۵ء میں ہندوؤں نے اپنی سیاسی جماعت ’’آل انڈیا کانگریس‘‘ قائم کر لی۔ سیدھی سی بات تھی کہ اگر کل کلاں ہندوستان میں بھی جمہوریت قائم ہوتی ہے تو ہم (یعنی ہندو) اکثریت میں ہیں‘ ہمیں ہی حکومت کرنے کا موقع ملے گا اور ہم مسلمانوں کو محکوم بنا کر ماضی کا ادھار چکا سکیں گے۔ ہندو جانتا تھا کہ وہ ہند کے مسلمانوں کو عسکری لحاظ سے کبھی بھی پچھاڑ نہ سکے گا اور کبھی بھی پورے ہندوستان کا حکمران نہیں بن سکے گا۔ لہٰذا اب انگریز اگر ہندوستان سے نکل جائے تو

ہندوؤں کو حکمران بننے سے کوئی نہ روک سکے گا۔

مہاتما گاندھی کی ساری جدّوجہد اسی تصور کے تحت تھی۔ لہٰذا کبھی ’’ہندوستان چھوڑو‘‘ تحریک چلائی گئی اور کبھی گاندھی نے ’’مرن بھرت‘‘ رکھے۔ یہ سب اسی مقصد کے لیے تھے۔ مسلمانوں نے بھی اگرچہ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ بنالی لیکن اُس وقت کی مسلم لیگی قیادت جو زیادہ تر نوابوں پر مشتمل تھی‘ مخلص ہونے کے باوجود دنیا میں جمہوریت کے غلغلے اور اُس کے ہندوستان پر پڑنے والے زبردست اثرات سے بالکل بے خبر محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے مسلم لیگ کو ایک عوامی جماعت بنانے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ مسلم لیگ کے اکابرین اکثر اپنی حویلیوں کی بیٹھک میں ہی سیاسی حالات پر گفتگو اور تبصرے کو کافی سمجھتے تھے۔ قائداعظم جو ابھی صرف محمد علی جناح ہی تھے‘ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کانگریس میں شمولیت سے کیا۔ وہ ایک ذہین انسان تھے‘ انہیں یہ بات سمجھنے میں بالکل دیر نہ لگی کہ کانگریس کا اصل مقصود ہندو کی بھلائی اور بہتری ہے اور وہ انگریز کے ہندوستان سے نکلنے کے بعد پورے ملک پر ہندو حکمرانی کا خواب دیکھ رہی ہے۔ لہٰذا وہ کانگریس سے علیحدگی اختیار کر کے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ توقع کے برعکس‘ وہ مسلم لیگ کے رہنماؤں سے بہت مایوس ہوئے۔ اُن کے ایک بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ انگریز مسلم لیگ میں اپنے کچھ ایجنٹ بھی شامل کر چکا ہے۔ چنانچہ وہ ناامید ہو کر برطانیہ چلے گئے۔

علامہ اقبال کا جب دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں برطانیہ جانا ہوا تو انہوں نے جناح کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی آزادی کو اسلام کے حوالے سے دیکھیں۔ ہندوستان جا کر لوگوں کے ذہن میں یہ بات ڈالیں کہ آپ کو یہاں ایک مسلمان اور زندہ قوم کی حیثیت سے رہنا ہوگا۔ لہٰذا مسلمان صرف انگریز کو ہی ہندوستان سے نہیں نکالنا چاہتا بلکہ اس ملک میں ایک باعزت مقام بھی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ علامہ اقبال نے جناح کو یہ مشورہ دیا کہ ہندوستان آ کر مسلمانوں کو اسلام کا انجکشن لگاؤ۔ جناح نے علامہ کا یہ مشورہ قبول کیا اور ہندوستان واپس آ کر مسلم لیگ کو ایک عوامی جماعت بنانے کا کام شروع کیا۔ حیرت انگیز حد تک جناح اس میں کامیاب ہو گئے۔ جناح کی زبان انگریزی تھی‘ وہ اُردو اچھی نہیں بول سکتے تھے‘ لیکن اس کے باوجود وہ مسلمانانِ ہند میں مقبول ہونا شروع ہو گئے۔

راقم کہنا یہ چاہتا ہے کہ جب مسلمانانِ ہند کے سامنے اسلام کے حوالے سے بات رکھی گئی تو انہوں نے اُسے ذہنی اور دلی طور پر قبول کیا۔ پاکستان کا مطالبہ اگرچہ بعد میں آیا لیکن ہندوستان کے مسلمان کے لیے آزادی اور اسلام اب ایک نظریہ اور تصور بن گیا۔ پھر جب پاکستان کا مطالبہ سامنے آیا تو مسلم لیگ کا نعرہ ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!'' ایک بہت بڑی حقیقت بن گئی جو آنے والے وقت کی نشان دہی کر رہی تھی۔ راقم یہ تسلیم کرتا ہے کہ اگرچہ ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا اِلٰہ اِلا اللہ!'' کا نعرہ مسلم لیگ کے سٹیج سے نہیں لگایا گیا تھا لیکن مسلم لیگ نے اس نعرہ کو own کر لیا۔

قیامِ پاکستان کے حوالے سے اِس تفصیل کے بعد اگر کسی کو شک ہے کہ پاکستان کی بنیاد اسلام کے علاوہ کچھ اور تھی تو جواب کے طور پر عرض ہے کہ انکارِ محض اور ڈھٹائی کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ البتہ اس حقیقت سے انکار کرنا کہ اقتصادی مشکلات نے بھی تحریک پاکستان کو مہمیز لگائی، تاریخ کو جھٹلانا ہوگا۔ اس لیے کہ جب ۱۹۳۷ء میں ہندوستان میں انتخابات کروائے گئے تو کانگریس نے مکمل فتح حاصل کی، گویا یہ ایک لینڈ سلائنڈ وکٹری تھی۔ مسلم لیگ ایک نشست بھی نہ جیت سکی۔ ہندوستان کے تمام گیارہ صوبوں میں کانگریس حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلم لیگ کی شکست اور کانگریس کی کامیابی نے سوئی ہوئی مسلم قوم کی کمر پر چابک کا کام کیا۔ ہوا یوں کہ ہندوؤں کو یہ کامیابی راس نہ آئی۔ انہوں نے اسے مسلمانوں کو کچلنے کا سنہری موقع سمجھا، یوں ان کی تنگ دلی اور پست ذہنیت کھل کر سامنے آگئی۔ انہوں نے مسلمانوں کو ہر لحاظ سے خصوصاً اقتصادی طور پر دیوار سے لگانا شروع کر دیا جس سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۴۶ء میں جب انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ نے تمام مسلمان نشستیں جیت لیں۔ گویا نو سال کے قلیل عرصہ میں ایک انقلاب رونما ہو گیا۔ اس پر بعض ''دانشور'' یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پاکستان کی بنیاد اسلام نہیں بلکہ معاشی اور اقتصادی مسئلہ تھا۔ یہ دلیل اگر مان بھی لیں تو بڑا سادہ سا سوال ہے کہ جن کی معیشت تنگ کی گئی تھی اس کی وجہ ان کا مذہب یعنی مسلمان ہونا ہی تھا۔ گویا بات پھر وہاں پہنچ گئی کہ چونکہ مذہب ہی وجہ تنازع تھا، لہٰذا اسلام ہی پاکستان کی حقیقی بنیاد بنا۔ البتہ یہاں ایک اہم بلکہ انقلابی سوال سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر مسلم لیگ ۱۹۳۷ء کی طرح ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں بھی بری طرح ہار جاتی تو کیا تحریک پاکستان کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی تھی؟ اس کا جواب ہے: ہرگز نہیں! انگریز اور ہندو کا مطالبہ

پاکستان تسلیم کرنا تو دور کی بات، وہ یہ مطالبہ سننے کو بھی تیار نہ ہوتے۔ گویا یہ ثابت ہوا کہ پاکستان کی بنیاد صرف اور صرف اسلام ہے اور پاکستان کے قیام کا ذریعہ صرف جمہوریت اور ووٹ ہے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے نتائج نے قابض انگریز اور اکثریتی جماعت آل انڈیا کانگریس کو اس قابل ہی نہ چھوڑا کہ وہ مطالبہ پاکستان کو رد کر سکتے۔ لہٰذا انتخابات کے نتائج سے پیدا ہونے والی نئی صورت حال کا منطقی تقاضا تھا کہ فریقین ۳ جون ۱۹۴۷ء کی تاریخ ساز اور فیصلہ کن میٹنگ میں مطالبہ پاکستان کو تسلیم کر لیں۔ چنانچہ انہیں یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑا۔

اب آیئے اس طرف کہ جس پاکستان کے قیام کی بنیاد اسلام اور ذریعہ جمہوریت ہے، اس میں روزِ اوّل سے آج تک اسلام اور جمہوریت کے ساتھ کیا سلوک ہوا! قیامِ پاکستان کے فوری بعد اُس وقت کی وفاقی حکومت نے جمہوریت پر ایک کاری ضرب لگائی اور صوبہ سرحد کی حکومت کو ایک انتظامی حکم کے ذریعے نیست و نابود کر دیا۔ اگرچہ سرحدی گاندھی غفار خان کا اپنا کردار تھا لیکن اس کی سزا صوبہ سرحد کے عوام کو نہیں دی جانی چاہیے تھی۔ پھر ۱۹۵۹ء تک جمہوریت کی جس طرح آبرو ریزی ہوئی، وہ ناقابل بیان ہے۔ صرف لیاقت علی خان چار سال تک وزیر اعظم رہے۔ ان کے بعد ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۹ء کے مارشل لا تک صرف آٹھ سال میں ناظم الدین، محمد علی بوگرا، چودھری محمد علی، حسین شہید سہروردی، آئی آئی چندریگر اور فیروز خان نون چھ وزرائے اعظم بنائے بھی گئے اور انتظامی احکامات سے برخاست بھی کیے گئے۔ پھر ۱۹۵۹ء میں جمہوریت کا بوریا بستر مکمل طور پر لپیٹ دیا گیا اور نو سال کی مدت میں تشکیل پانے والا وہ آئین جو جمہوریت کا علم بردار بھی تھا اور جس سے اسلامی طرزِ حکومت کی منزل بہت قریب آگئی تھی، اسے بھاری بوٹوں نے پاؤں تلے روند ڈالا۔ لہٰذا پنجابی محاورے کے مطابق ''جتھوں دی کھوتی اوتھے ای آن کھلوتی'' (گدھی جہاں سے چلی تھی وہیں واپس آکھڑی ہوئی) جمہوریت کے حوالے سے مزید پسپائی ہوئی۔ فوجی عدالتیں قائم ہو گئیں۔ بنیادی انسانی حقوق متاثر ہوئے۔ لوگوں کا آزادیٔ رائے کا حق چھین لیا گیا۔ پھر مارشل لاؤں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا گیا جو ہر بار مختلف انداز میں سامنے آیا۔

جنرل یحییٰ خان کا مارشل لاء یوں تو جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت ہی کا تسلسل تھا۔ اس نے تین ماہ میں انتخابات کروانے اور عوامی نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنے کا اعلان کیا، لیکن اقتدار منتقل کرنے کے حوالے سے ٹال مٹول کرتا رہا جس کے نتیجے میں ملک دولخت ہو گیا۔ جنرل

ضیاء الحق کو ''تحریک نظامِ مصطفیٰ'' کی آڑ میں مارشل لاء لگانے کا موقع ملا تھا۔ اس نے گیارہ سال ''اسلام اسلام'' کی چیخ وپکار کر کے اپنے اقتدار کو طول دیا اور پھر جب بادلِ نخواستہ انتخابات کرائے بھی تو اپنے ہی وزیر اعظم کو برخاست کر دیا۔ جنرل ضیاء الحق نے جمہوریت کو اپنی کرسی سے یوں باندھ رکھا تھا کہ جب چاہتا' کسی بھی طرف اُسے موڑ دیتا۔ جنرل پرویز مشرف نے مارشل لاء کا لفظ لگانے اور استعمال کرنے سے گریز کیا اور اپنے ساتھ چیف ایگزیکٹو کا سابقہ لگا کر ایسا تاثر دیا جیسے یہ محض اُس حکومت کی تبدیلی ہے جو آرمی چیف کے حوالے سے غلط فیصلہ کرنے جا رہی تھی۔ دراصل جنرل مشرف نے امریکہ کے اشارے پر یہ ناٹک رچایا تھا اور میاں نواز شریف کی عوامی حکومت کو برطرف کر دیا تھا۔ بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ امریکہ نے نائن الیون کا ڈرامہ رچانے سے پہلے جنرل مشرف کے ذریعے پاکستان میں اُس وقت کی عوامی حکومت اس لیے برخاست کروائی تھی تاکہ وہ بااختیار فوجی آمر سے آسانی کے ساتھ معاملات طے کر سکے' کیونکہ پاکستان میں اگر جمہوری حکومت قائم رہتی تو امریکہ کو اپنے مطالبات منوانے میں بعض مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ یہ بات بھی اپنی جگہ پر بڑی اہم ہے کہ جنرل مشرف کو اپنی حکومت کے ختم ہونے پر جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ اسے پاکستان چھوڑنا پڑا' اس ردِّعمل کو سمجھتے ہوئے مقتدر قوتوں نے براہِ راست مارشل لاء لگانے اور خود حکومت سنبھالنے کے بجائے ریموٹ کنٹرول سول حکومتیں لانے کا فیصلہ کیا جو آج تک کسی نہ کسی انداز میں جاری ہے۔ آج پاکستان میں نقاب پوش مارشل لاء نافذ ہے۔ دنیا کو دکھانے کے لیے ایک سول حکومت بنی ہوئی ہے جو نہ داخلی پالیسی بنانے کا اختیار رکھتی ہے نہ خارجہ پالیسی۔ اسے صرف عوامی وسائل کی لوٹ کھسوٹ کی اجازت ہے تاکہ وہ اپنی جگہ مطمئن رہے۔ گویا جمہوریت جو پاکستان کے قیام کا ایک ذریعہ تھی' اس کی یوں درگت بنی۔

یہاں ایک بات کی وضاحت انتہائی ضروری ہے۔ اسلامی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے ہمارے بعض بھائی مغربی معاشرے کے ساتھ ساتھ مغرب میں رائج جمہوری طرزِ حکومت سے بھی شدید نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک مغرب میں قائم مادر پدر آزاد جمہوریت کا تعلق ہے جس میں اکاون فیصد کی اکثریت سے آپ جو چاہیں قانون منظور کر لیں اور اللہ کے اٹل قوانین کو بھی نظر انداز کر دیں وہ یقیناً کفر ہے اور کلیتاً کفر ہے' لیکن کوئی ایسا طرزِ حکومت جو عوام کی اکثریتی رائے سے طے پایا ہو اور جس میں اللہ اور رسول ﷺ کی بالادستی کو عملاً تسلیم کیا گیا ہو وہ طرزِ حکومت' اُسے جمہوری کہیں یا کچھ اور' کسی

طرح بھی غلط نہیں۔ جس طرح پاکستان کے آئین میں واضح طور پر درج ہے کہ قرآن اور سنت سے انحراف کر کے کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ گویا راقم کی رائے میں مغربی جمہوریت تو یقیناً کفر ہے لیکن ایسی جمہوریت ہرگز کفر نہیں جو اُس طرح کے دستور کے مطابق ہو جیسا پاکستان کا دستور ہے۔ اگرچہ پاکستان کی حکومتیں اِس دستور کی بہت سی اسلامی شقات پر عمل نہیں کرتیں لیکن نظری طور پر دستور کو تسلیم کرتی ہیں۔ اس کی مثال بالکل اِس طرح ہے جیسے کوئی مسلمان گناہ گار تو ہو لیکن اسلام کے بنیادی ارکان پر ایمان رکھتا ہو۔ لہٰذا پاکستان جیسے اسلامی ملک میں جمہوریت کا ہونا فطری بھی ہے اور ناگزیر بھی۔ وگرنہ مخالفین جمہوریت اِس بات کی وضاحت کر دیں کہ ۲۵ کروڑ کی آبادی کے ملک میں آخر کیسے طے کیا جائے گا کہ کسے حکومت کرنے کا حق ہے اور کسے نہیں؟ لہٰذا ہمارے ساتھی مغربی جمہوریت کی مخالفت ضرور کریں' جمہوریت کی مخالفت نہ کریں یا اس کا بدل تجویز کریں جو قابل عمل ہو۔

اسلام اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی کہانی جمہوریت سے بھی زیادہ دردناک ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس وقت کی حکومت نے نفاذِ اسلام کے حوالے سے ٹال مٹول شروع کیا تو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جنہوں نے قائداعظم اور پاکستان کی حمایت کرنے پر اپنی جماعت جمعیت علماء اسلام ہند سے لڑائی مول لے لی تھی' انہوں نے اسمبلی میں اور اسمبلی سے باہر بھی حکومت کو بار بار وارننگ دی کہ وہ اسلام کو بطورِ نظام پاکستان میں نافذ کرے' لیکن یہ سب بے سود رہا۔ بالآخر انہوں نے قومی اسمبلی میں انتہائی پُرجوش تقریر کی کہ اگر حکومت نے یہی انداز اختیار کیے رکھا تو وہ عوام میں جائیں گے اور لوگوں کو بتائیں گے کہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کو دھوکا دیا ہے۔ یہ تنبیہ کارگر ثابت ہوئی اور اسمبلی نے ''قراردادِ مقاصد'' منظور کی۔ البتہ اس قرارداد کو عملی شکل دینے میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ پھر ۱۹۵۱ء میں تمام مکاتب فکر کے ۳۱ علماء نے ۲۲ نکات پر مشتمل ایک جامع منصوبہ پیش کیا اور ان سیکولر طبقات کو منہ توڑ جواب دیا جو کہتے تھے کہ کس کا اسلام نافذ کیا جائے! اہل سنت کا یا اہل تشیع کا؟ یا کسی تیسرے فرقے کا؟ بدقسمتی سے ۱۹۵۱ء ہی میں لیاقت علی خان کو شہید کر دیا گیا۔ شنید ہے کہ وہ ''قراردادِ مقاصد'' پر عمل درآمد کے حوالے سے سنجیدہ اقدامات کرنے جا رہے تھے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پاکستان میں اسلام کا نام اپنی سیاست چمکانے کے لیے تو بہت استعمال ہوا' سیاسی نعرہ بازی اِس حوالہ سے بہت ہوئی لیکن آج تک کوئی ایک تحریک بھی خالصتاً پاکستان میں نفاذِ اسلام کے حوالے سے نہیں چل سکی۔

کون نہیں جانتا کہ تحریک نظامِ مصطفیٰ ؐ بنیادی طور ”بھٹو حکومت ہٹاؤ“ تحریک تھی جس میں عوامی جذبات کو اُبھارنے کے لیے اسلام کا نام استعمال ہوا۔ لہٰذا جونہی بھٹو کی حکومت ختم ہوئی‘ اسلام کے نفاذ کے مطالبے کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ قادیانیوں کے خلاف‘ مقدس ہستیوں کی بے حرمتی کے خلاف‘ 295-C کو آئین میں برقرار رکھنے کے لیے اور دینی مدارس میں حکومتی مداخلت کے خلاف یقیناً تحریکیں چلی ہیں اور کامیاب بھی ہوئی ہیں کہ حکومت کو اپنے فیصلے بدلنے پڑے لیکن یہ سب جزوی معاملات تھے۔ مکمل اسلامی نظام کے قیام کے لیے پاکستان میں ہرگز کوئی تحریک نہیں چلائی گئی۔

معذرت کے ساتھ‘ تمام اسلامی جماعتیں اس حوالے سے غفلت کا شکار نظر آتی ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ پہلے عام سیاسی جماعتیں اور مذہبی سیاسی جماعتیں دونوں انتخابات کے موقع پر اسلام اور اسلامی نظام کا نعرہ لگا لیتی تھیں‘ اب وہ بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اس حوالے سے عام آدمی کو بھی بریُ الذمہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ انتخابات میں حصہ لینے والی جماعتوں کو بھی معلوم ہو چکا ہے کہ عوام کی دلچسپی معاشی مفادات تک محدود ہے۔ لہٰذا وہ اسلام کا نعرہ لگانے کی بجائے ”روٹی کپڑا مکان“ کا نعرہ لگاتے ہیں۔ کوئی گھر بنا کر دینے کا وعدہ کرتا اور کوئی قرضہ دلانے کا وعدہ کرتا ہے۔ گویا ہم نظریہ پاکستان یعنی اسلام سے بھی دست بردار ہو چکے ہیں اور حصول پاکستان کے ذریعہ یعنی جمہوریت کو بھی زندہ درگور کر دیا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ پھر پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان رسوا کیوں ہوا! پاکستان ڈیفالٹ کیوں ہوا چاہتا ہے؟ پاکستان میں عدل مقتدرہ کی چوکھٹ پر سجدہ ریز کیوں ہے؟ پاکستان سیاسی عدم استحکام کا شکار کیوں ہے؟ ہمارے حکمران ہاتھوں میں کشکول لیے کفار کے دَر پر دستک کیوں دے رہے ہیں؟ یہ دہشت گردی کیوں ہو رہی ہے؟ بھائی بھائی کا گلا کیوں کاٹ رہا ہے؟ صد ہزار سوال ہوں‘ تب بھی ایک ہی جواب ہے کہ واپس آ جاؤ اپنے بنیادی نظریہ پر۔ اللہ اور رسول ﷺ کا دامن تھام لو بلکہ دانتوں سے یوں پکڑ لو کہ دانت ٹوٹ جائیں‘ نظریاتی بنیاد نہ چھوٹے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یاد رکھو‘ اپنے عوام کے رجحان اور ان کی رائے کو یکسر نظرانداز کرنے کا وہی نتیجہ نکلتا ہے جو ۱۹۷۱ء میں نکلا تھا۔ اللہ ربّ العزت ہمیں مستقبل میں سقوطِ ڈھاکہ جیسے سانحہ سے بچا کر رکھے۔ آمین یا ربّ العالمین!

❁❁❁

تکبّر اور اس کا علاج

حافظ محمد اسد☆

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو تکبر سخت ناپسند ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ ۝۲۳﴾ (النحل)

”یقیناً وہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

اسی طرح حدیثِ قدسی ہے:

((اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي، وَالْعَظَمَةُ إِزَارِي، فَمَنْ نَازَعَنِي وَاحِدًا مِنْهُمَا قَذَفْتُهُ فِي النَّارِ))(رواہ ابوداؤد: ۴۰۹۰)

”کبریائی (بڑائی) میری چادر اور عزت میری ازار ہے۔ چنانچہ جو شخص ان دونوں میں سے کوئی شے مجھ سے کھینچے گا میں اسے جہنم میں جھونک دوں گا۔“

یہ حدیث الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ صحیح مسلم (۶۶۸۰) میں بھی وارد ہوئی ہے۔

تکبر بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے۔ یہ ایسا مرض ہے جس میں مبتلا شخص کبھی اپنے آپ کو بیمار نہیں سمجھتا۔ کبر کے معنیٰ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلے میں بڑا سمجھنا ہیں۔ جب کوئی اپنے آپ کو اچھا سمجھے گا تو معاملات میں‘ گفتگو میں‘ میل جول میں اس کا اظہار بھی ہو جائے گا۔ ہمارے معاشرے کی اکثریت اس بیماری میں مبتلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اخلاق و کردار میں وہ اعلیٰ صفات جو کبھی اُمتِ محمدی ﷺ کا خاصہ ہوا کرتی تھیں‘ آج ڈھونڈے نہیں ملتیں۔ صحابہؓ و تابعینؒ سے موجودہ زمانے کے صالحین کاملین تک جس کو جو کمال حاصل ہوا ہے وہ اپنے باطن کی اصلاح ہی کی بدولت ملا ہے۔ وہ صرف صوم وصلوٰۃ ہی کے پابند نہیں تھے بلکہ کبر و نخوت‘ تحقیر و توہین‘ حُبِ جاہ جیسے باطنی امراض سے بھی مجتنب تھے۔ ہر وقت اپنی باطنی اصلاح کی فکر میں رہتے تھے۔ علم و معرفت کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تکبر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

☆ استاذ قرآن اکیڈمی‘ یٰسین آباد‘ کراچی

روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ)) قَالَ رَجُلٌ: اِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَّكُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَ نَعْلُهُ حَسَنَةً، قَالَ: ((اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَ غَمْطُ النَّاسِ)) (صحیح مسلم: ۲۶۵)

''جس کسی کے دل میں رائی کے ایک دانے کے برابر بھی تکبر ہو' وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔'' ایک آدمی نے کہا کہ آدمی کو یہ پسند ہوتا ہے کہ اُس کا لباس عمدہ ہو اور اُس کا جوتا عمدہ ہو (کیا یہ سب غلط ہے)؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ خود بھی خوب صورت ہے اور وہ خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔ تکبر تو حق کو ٹھکرا دینا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔''

معلوم ہوا کہ تکبّر کی اصل حقیقت حق کا انکار اور دوسروں کو حقیر سمجھنا ہے۔ بعض لوگ اپنے آپ کو اتنی بڑی چیز سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کو یہ باور کرانا نہایت مشکل ہو جاتا ہے کہ جس چیز کو وہ جانتے اور مانتے ہیں' حق اس کے سوا کچھ اور بھی ہوسکتا ہے یا ان کے سوا کوئی اور شخص بھی کسی احترام یا اعتراف کا مستحق ہوسکتا ہے۔ یہ اپنی ''عزّت و شرف'' کو اللہ کا فضل سمجھنے کے بجائے اپنا پیدائشی اور موروثی حق سمجھتے ہیں یا اپنی قابلیت کا ثمرہ خیال کرتے ہیں۔ انسان کے لیے مہلک چیزوں میں سے ایک خود فریبی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ثَلَاثٌ مُهْلِكَاتٌ وَ ثَلَاثٌ مُنْجِيَاتٌ، فَقَالَ: ثَلَاثٌ مُهْلِكَاتٌ : شُحٌّ مُطَاعٌ وَ هَوًى مُتَّبَعٌ وَ إِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِه. وَ ثَلَاثٌ مُنْجِيَاتٌ: خَشْيَةُ اللّٰهِ فِي السِّرِّ وَ الْعَلَانِيَةِ وَ الْقَصْدُ فِي الْفَقْرِ وَ الْغِنَى وَ الْعَدْلُ فِي الْغَضَبِ وَ الرِّضَا)) (السلسلة الصحيحة: ۱۸۰۲)

''تین عادتیں ہلاک کرنے والی ہیں اور تین عادتیں نجات دلانے والی ہیں۔ ہلاک کرنے والی عادتیں یہ ہیں: انتہائی بخل' خواہش پرستی اور خود پسندی۔ اور تین عادتیں نجات دلانے والی یہ ہیں: ظاہر اور پوشیدہ میں اللہ کی خشیت' محتاجی اور غنی میں میانہ روی' غصے اور خوشی میں انصاف کرنا۔''

قرآن مجید میں جہاں بھی شیطان لعین کی نافرمانی کا ذکر ہے وہاں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں: ﴿اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ﴾ ''اُس نے انکار کیا اور تکبّر کیا۔'' گویا تکبر ہی انکار کی اصل وجہ بنی ورنہ

شیطان کے پاس اللہ کا دیا ہوا بہت سا علم تھا۔ اس کا وہ علم کچھ کام نہ آیا' تکبّر نے اسے اللہ کی رحمت سے ہمیشہ کے لیے دور کر دیا۔ گویا۔

تکبّر عزازیل را خوار کرد
بزندانِ لعنت گرفتار کرد

''تکبر ہی نے ابلیس کو ذلیل وخوار کیا' اور اسے ابدی لعنت کا مستحق بنایا۔''

دراصل اپنے کو اچھا سمجھنا اور دوسرے کو کمتر سمجھنا تکبر کی بنیاد ہے جو کسی بھی اعتبار سے جائز نہیں۔ جب بندہ اپنی نظر میں حقیر ہوتا ہے تو حق تعالیٰ کی نظر میں عزّت والا ہوتا ہے اور جب اپنی نظر میں اچھا اور بڑا ہوتا ہے تو حق تعالیٰ کی نظر میں حقیر اور ذلیل ہوتا ہے۔ معاصی سے نفرت واجب ہے لیکن عاصی سے نفرت حرام ہے۔ یہاں تک کہ کسی کافر کو بھی حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھو' کیوں کہ عین ممکن ہے کہ اس کا خاتمہ ایمان پر مقدر ہو چکا ہو۔ البتہ اس کے کفر سے نفرت کرنا ضروری ہے۔ جب حق تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ چاہے تو بڑے سے بڑا گناہ بغیر سزا کے معاف کر دے اور چاہے تو چھوٹے گناہ پر گرفت کر کے عذاب میں پکڑ لے تو پھر آدمی کس منہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور کیسے کسی مسلمان کو حقیر سمجھے' خواہ وہ کتنا ہی گناہ گار ہو۔

امام غزالی ؒ فرماتے ہیں کہ ولایت وقرب کو حق تعالیٰ نے بندوں اور اپنے درمیان مخفی رکھا ہے' لہٰذا کسی بندے کو خواہ وہ کیسا ہی گناہ گار ہو حقیر نہ جانو۔ کیا خبر کہ شاید یہی بندہ علم الٰہی میں ولی ہو اور اس کی ولایت کسی وقت بھی توبہ صادقہ اور اتباعِ سُنّت کی صورت میں ظاہر ہو جائے۔ بعض بندے زندگی بھر رند بادہ نوش اور فسق وفجور میں مبتلا رہتے ہیں' پھر اچانک اُن میں تبدیلی آ جاتی ہے اور توبہ کر کے پاک صاف ہو جاتے ہیں' جیسے کوئی حسین شاہزادہ جس کے چہرے پر کالک لگی ہو اور اچانک صابن سے منہ دھو کر چاند کی طرح روشن چہرے والا ہو جائے۔

تکبر ایک ایسا موذی مرض ہے جس کی اگر بروقت تشخیص ہو جائے تو اس کا علاج ممکن ہے۔ اگر اس کا علاج نہ کیا جائے تو یہ انسان کو ہلاک کر کے جہنم کا مستحق بنا کر چھوڑتا ہے۔ افسوس کہ بندہ اسی گھمنڈ میں رہتا ہے کہ وہ صحیح ہے۔ جیسے ہم اپنے ظاہری امراض کی علامات پیدا ہوتے ہی کسی معالج کا رخ کرتے ہیں بالکل اسی طرح باطنی امراض کی علامات کو بھی جانیں اور اس کے علاج کی فکر کریں۔ ایسا کرنا ہماری دینی ذمہ داری ہے۔ تکبر کی سب سے ابتدائی علامت

''حُبِّ جاہ'' کا پیدا ہونا ہے۔ یعنی اپنی تعریف چاہنا مگر دوسروں کو حقیر نہ سمجھنا۔ ایسے میں انسان غور کرے کہ یہ صلاحیت جس پر میری تعریف ہو رہی ہے' میرے خالق ہی کی عطا کردہ ہے' اس میں میرا کیا کمال ہے۔ بار بار یہ سوچتا رہے اور شکر ادا کرتا رہے تو کافی مفید ثابت ہوگا۔ اگر خیال نہ کیا گیا تو اگلا مرحلہ شروع ہو جائے گا جسے ''فخر'' کہتے ہیں اور یہ اس بیماری کی دوسری علامت ہے۔ اب انسان خود سے اپنی تعریف کرنا شروع کر دے گا اور اگر اس کی تعریف نہیں کی جائے گی تو اس کو تعجب ہوگا۔ سوچے گا کہ لوگ اس کی تعریف کرنے میں بخیل ہیں' یا شاید حسد کی آگ میں جل رہے ہیں اس لیے کچھ نہیں کہتے' ورنہ مجھ جیسا علم و ہنر رکھنے والا آج کے زمانے میں کہاں ہے! یہ خود پسندی کی انتہا ہے۔ اب مرض شدّت اختیار کر چکا ہے لیکن ابھی لا علاج نہیں ہے۔ اگر کسی مربی' کسی بزرگ کی صحبت میں جائے اور اپنی باطنی حالت بتائے تو اصلاح ممکن ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اب ''تکبر'' کا وہ مرحلہ شروع ہو گیا جہاں سے یہ مرض ہلاکت خیز صورت اختیار کر جائے گا۔ اب یہ کیفیت ہے کہ کسی کی بات سننا' کسی سے مشورہ کرنا' کسی کو اپنا بڑا سمجھنا یہ اس کے لیے کبھی تیار نہیں ہوگا۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کبھی علماء کرام اور بزرگوں کو تنقید کا نشانہ بنا رہا ہے' کبھی اپنے خاندان کے بڑوں کا مذاق اڑا رہا ہے اور کبھی کسی سے جھگڑا کر رہا ہے۔ وہ کسی صورت بھی اپنے آپ کو غلط نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک ساری دنیا تو غلط ہو سکتی ہے مگر وہ نہیں۔ متذکرہ بالا حدیث میں اس ہلاک کرنے والی عادت کے لیے ''اِعْجَابُ الْمَرءِ بِنَفْسِہٖ'' کے الفاظ آئے ہیں۔

اسی مرض کی ضد یہ ہے کہ بعض لوگ ''تکبر'' سے تو کوسوں دور ہوتے ہیں لیکن اپنے آپ کو اس قدر حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے اپنی تذلیل ہی پسندیدہ ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ اکثر اپنے اُن گناہوں کا تذکرہ بھی برملا کر دیا کرتے ہیں جن کو صرف وہ اور اُن کا رب جانتا ہے۔ ہر بات میں اپنی عاجزی اور کمتری کا اظہار کرنا' مثلاً یہ کہنا کہ میں بہت گھٹیا' ناکارہ اور حقیر سا آدمی ہوں' اب آپ کو کیا بتاؤں جوانی کے دنوں میں کیا کرتا رہا ہوں! یہ طرزِ عمل اصلاً تو تکبر کی ضد ہے لیکن دینی مزاج کے خلاف ہے۔ ہمارا دین ہمیں اپنے گناہوں کا چرچا کرنے سے منع کرتا ہے۔ اپنے گناہوں کا اظہار مخلوق کے سامنے کرنے والے کے لیے سخت وعید آئی ہے۔ چاہیے کہ گناہ کا ارتکاب کرنے والا شخص اپنے دوست احباب کے پاس اس کو بیان نہ کرے۔ گناہ چھپانے کی

چیز ہے۔ لہٰذا حیا اور خوفِ خدا کا تقاضا ہے کہ کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر پردہ ڈالا جائے اور اللہ سے اس کی مغفرت طلب کی جائے۔ اگر کوئی شخص کسی معصیت کا ارتکاب کرے اور پھر لوگوں کے سامنے اس کو بیان کرتا پھرے تو اس حرکت پر اللہ تعالیٰ سخت غضب ناک ہوتا ہے۔ اپنے گناہ کو عام کرنے اور لوگوں کے سامنے اظہار کا مطلب ہے کہ ایسے شخص کو اپنی حرکت پر ندامت نہیں' نہ عذاب کا خوف ہے اور نہ گرفت کا احساس' گویا وہ اپنے گناہ پر سخت جری ہے۔ جس شخص کو اپنی معصیت پر ندامت کے بجائے جسارت اور گھمنڈ ہو جائے' اس کی معافی کا کیا سوال! حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((كُلُّ أُمَّتِي مُعَافًى إِلَّا الْمُجَاهِرِينَ، وَإِنَّ مِنَ الْمُجَاهَرَةِ أَنْ يَعْمَلَ الرَّجُلُ بِاللَّيْلِ عَمَلًا، ثُمَّ يُصْبِحَ وَقَدْ سَتَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ، فَيَقُولَ: يَا فُلَانُ، عَمِلْتُ الْبَارِحَةَ كَذَا وَكَذَا، وَقَدْ بَاتَ يَسْتُرُهُ رَبُّهُ، وَيُصْبِحُ يَكْشِفُ سِتْرَ اللّٰهِ عَنْهُ)) (صحيح البخاري: ٦٠٦٩)

''میری تمام اُمت معاف کر دی جائے گی سوائے اعلانیہ گناہ کرنے والوں کے۔ اور اعلانیہ گناہ کرنے میں یہ بھی شامل ہے کہ کوئی شخص رات کو کسی گناہ کا ارتکاب کرے اور اس کی صبح اس حال میں ہو کہ اللہ نے اس کے گناہ پر پردہ ڈالے رکھا ہو اور وہ (کسی سے) کہے کہ اے فلاں! میں نے کل رات یہ یہ کام کیا ہے' جب کہ اُس کی رات اس حال میں گزری تھی کہ اللہ نے اس کے گناہ پر پردہ ڈالے رکھا تھا' لیکن صبح ہوتے ہی وہ خود اپنے بارے میں اللہ کے پردے کو کھولنے لگا۔''

یاد رکھیں تکبر اور تذلّل دو انتہائیں ہیں جن میں درمیانی راہ تواضع ہے۔ تواضع کا تعلق قلب اور روح سے ہے' جسم سے نہیں۔ حضرت ابوسعید خدری ؓ رسول اللہ ﷺ کا مبارک ارشاد نقل کرتے ہیں:

((مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ دَرَجَةً، رَفَعَهُ اللّٰهُ دَرَجَةً حَتّٰى يَجْعَلَهُ فِي عِلِّيِّينَ، وَمَنْ تَكَبَّرَ عَلَى اللّٰهِ دَرَجَةً وَضَعَهُ اللّٰهُ دَرَجَةً حَتّٰى يَجْعَلَهُ فِي أَسْفَلِ السَّافِلِينَ)) (مسند احمد: ٩٢٤٨)

''جس نے اللہ تعالیٰ کے لیے ایک درجہ تواضع اختیار کی' اللہ تعالیٰ اس کو بلحاظ درجہ اتنا بلند

کرے گا کہ اس کو علیین میں لے جائے گا‘ اور جس نے اللہ تعالیٰ پر ایک درجہ تکبر کیا‘ اللہ تعالیٰ اس کو درجے کے لحاظ سے اتنا پست کر دے گا کہ اس کو سب سے نچلے اور گھٹیا ترین لوگوں میں شامل کر دے گا۔‘‘

جب انسان کے اندر تواضع پیدا ہوتی ہے تو پھر ہر نعمت و قابلیت کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عطا سمجھتا ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے شکر بجالاتا ہے۔ ہر وقت زبان پر اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ کا کلمہ جاری رہتا ہے۔ ہمارے علماء کرام اور اسلاف کا یہی طریقہ رہا ہے۔ لہٰذا جو نعمت حاصل ہو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے‘ کیونکہ اُسی ذات کی نعمتیں ہر وقت برستی ہیں۔

بندے کی تخلیق میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی جتنی نعمتیں ہیں‘ جیسے تندرست بدن‘ آفات سے محفوظ جسم‘ صحیح آنکھیں‘ عقلِ سلیم‘ ایسی سماعت جو چیزوں کو سمجھنے میں معاون و مددگار رہے‘ ہاتھوں کا پکڑنا‘ پاؤں کا چلنا وغیرہ اور جتنی نعمتیں بندے پر فرمائی ہیں‘ جیسے بندے کی دینی اور دنیوی ضروریات کی تکمیل کے لیے پیدا کی گئیں تمام چیزیں‘ یہ اتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ ان کا شمار ممکن ہی نہیں۔ اگر کوئی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بظاہر چھوٹی سی نعمت کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ حاصل نہ کر سکے گا تو ان نعمتوں کا کیا کہنا جنہیں تمام مخلوق مل کر بھی شمار نہیں کر سکتی۔ اسی لیے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۱۸﴾ (النحل)

’’اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو اُن کا احاطہ نہیں کر سکو گے۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا‘ نہایت رحم کرنے والا ہے۔‘‘

شکر گزار بندے پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔ جب شیطان نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے مہلت مانگی تھی کہ میں تیرے بندوں کو بہکاؤں گا تو یہ بھی کہا تھا:

﴿وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۱۷﴾ (الاعراف)

’’اور تُو ان میں اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔‘‘

مطلب یہ کہ اکثر لوگ ناشکری کریں گے اور میرا کام (یعنی گمراہ کرنا) آسان ہو جائے گا۔ خاص طور پر نیک لوگ نیکی کے تکبر میں اپنی نیکیوں کو ضائع کر دیں گے اور بے خبر رہیں گے۔ چنانچہ جب کبھی اپنی کسی اچھی صفت پر نگاہ جائے تو اس پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے یہ صفت عطا فرمائی ہے‘ میں اس کا مستحق نہیں تھا۔ (باقی صفحہ 60 پر)

اسماء اللہ الحسنیٰ (۴)

از: پروفیسر حافظ قاسم رضوان

(۲۳) اَللَّطِیْفُ

یہ لطف سے ہے جس کے معنی گفتار و کردار میں نرمی اور مہربانی کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ لطیف (بڑا لطف و کرم کرنے والا) ہے کیونکہ اس کے جملہ اقوال و افعال بندوں پر رفق و مہربانی اور شفقت و عنایت کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ لطیف ہے اور اس کے لطف صوری نے اشیائے مادیہ کو صورِ جمیلہ‘ ہیئاتِ موزوں‘ اجسامِ لطیفہ اور اجرامِ نورانیہ کی خوشنمائی‘ تناسب‘ نورانیت‘ شفافیت‘ موزونیت اور رنگارنگی عطا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ لطیف ہے‘ اسی کے لطفِ علمی نے حکماء و عقلاء‘ سالکین و شائقین‘ مجاہدین و علماء راسخین‘ اولیاء و انبیاء کو بقدرِ مراتب عرفانِ علمی عطا فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ لطیف ہے اور اسی کے لطفِ علمی نے صاحبانِ عقل کو معاملت‘ معاشِ دوراں کو منفعت‘ اہلِ شعور کو آگاہی اور اہلِ تقویٰ کو بصیرت عطا فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ لطیف ہے اور اسی کا لطفِ معنوی اشیائے مجردہ‘ عقول و نفوس اور ملائکہ و انبیاء کی حسبِ ضرورت تربیت فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ لطیف ہے اور اس کا لطف اُخروی اہلِ قرب سے معیت رکھتا اور اہلِ ایمان کو نجاتِ اُخروی عطا فرمائے گا۔

لطف کے معنی دانائے امورِ مخفیہ اور واقفِ دقائقِ عجیبہ بھی ہیں۔ سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاۗءُ ۭ﴾ (آیت ۱۰۰) ’’بے شک میرا ربّ جو چاہے‘ اس کے لیے بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔‘‘ سورۃ الشوریٰ میں فرمایا: ﴿اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ﴾ (آیت ۱۹) ’’اللہ اپنے بندوں کے حق میں بہت مہربان ہے۔‘‘ قرآن میں چار مقامات پر اس کا استعمال اسم خَبِیْر کے ساتھ ہوا ہے۔ سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۱۶﴾ ’’یقیناً اللہ بہت باریک بین‘ ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔‘‘ سورۃ الملک میں فرمایا: ﴿وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۱۴﴾ ’’اور وہ بہت باریک بین‘ ہر شے کی خبر رکھنے والا ہے۔‘‘ اللہ تعالیٰ عزّوجل کی لطف و مہربانی تمام امور میں ہماری ہادی و رہنما ہے اور اسی ذات سے

توفیق خیر ملتی ہے۔

(۲۴) اَلْخَبِیْرُ

خَبَرَ یَخْبُرُ (ن) سے اسم الفاعل خَبِیر (خبر رکھنے اور جاننے والا) ہے۔ گویا خبیر وہ ہستی ہے جو جملہ اخبارِ غیب وشہادت کی اطلاع پر حاوی ہے‘ جو دنیا اور آخرت کے احوال کو جانتا ہے اور جسے تمام وقائع کی خبر ہے۔ جب خَبِیر کے ساتھ علیم کا اسم ہوتا ہے تب علیم کا تعلق علم ذات سے ہوتا ہے اور خبیر کا تعلق دوسرے افعال سے۔ قرآن مجید میں اس اسم کا اطلاق کہیں اسم بصیر کے ساتھ‘ کہیں اسم علیم کے ساتھ اور کہیں اسم لطیف کے ساتھ ہوا ہے اور یہ تمام اسماء اطلاع وخبر اور واقفیت وعلم کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتے ہیں۔ سورۃ الشوریٰ میں فرمایا: ﴿اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ ۝۲۷﴾ ”یقیناً وہ اپنے بندوں (کے حالات) سے باخبر‘ ان کو دیکھنے والا ہے۔“ سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ۝۱۶﴾ ”یقیناً اللہ بہت باریک بین‘ ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔“ سورۃ الانعام میں فرمایا: ﴿وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝۱۸﴾ ”اور وہ ہے کمال حکمت والا اور ہر شے کی خبر رکھنے والا“ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝۱۸۰﴾ ”اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔“

(۲۵) اَلْحَلِیْمُ

حلم کے معنی بُردباری‘ آہستگی اور عقل کے ہیں۔ سورۃ الطور کی آیت ۳۲ ﴿اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ﴾ ”کیا ان کی عقلیں انہیں یہی کچھ سکھا رہی ہیں“ —— میں حلم عقل و دانش کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ حلیم (بُردبار‘ برداشت کرنے والا) ہے‘ یعنی تغیراتِ اعتباریہ اس کی ذات میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتے۔ غضب اس کی رحمت پر غالب نہیں آ سکتا اور رحمت اس کی صفت غضب کے لیے مانع نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ حلیم ہے کہ بدلہ اور انتقام کے لیے جلدی نہیں کرتا اور گناہ کی سزا کے طور پر رزق کے دروازے بند نہیں کرتا۔ خدائے بزرگ و برتر نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا ذکر کرتے ہوئے انہیں حلیم کا لقب عطا فرمایا ہے‘ یعنی حضرت اسماعیلؑ میں اس قدر تمکینِ نفس اور وقارِ ذات تھا کہ جو سکون واطمینانِ قلب ان کو اپنی قربانی کی خبر سننے سے پہلے حاصل تھا‘ ان کی وہی حالت قربان ہو جانے کا حکم سن کر بھی رہی اور یہ عظیم خبر ان کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کر سکی۔ قرآن شریف میں لفظ حلیم درج

ذیل اسماء کے ساتھ آیا ہے:

سورۃ البقرۃ: ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ۝۲۲۵﴾ ”اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا‘ بردبار ہے۔“ سورۃ البقرۃ: ﴿وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ۝۲۶۳﴾ ”اور اللہ تعالیٰ غنی ہے اور حلیم ہے۔“ سورۃ الحج: ﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِیْمٌ حَلِیْمٌ ۝۵۹﴾ ”اور اللہ یقیناً سب کچھ جاننے والا‘ تحمل کرنے والا ہے۔“ سورۃ التغابن: ﴿وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِیْمٌ ۝۱۷﴾ ”اور اللہ شکور (یعنی قدردان) بھی ہے اور حلیم (یعنی بردبار) بھی۔“

غفران کے ساتھ حلم کا ہونا بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں کو جلد عذاب نہ دینا اس لیے ہے کہ اس ذات کی مغفرت بندے کو توبہ کی مہلت عطا فرماتی ہے۔ غنی کے ساتھ حلم کا ہونا بتاتا ہے کہ ایذا دینے والے‘ شرک کرنے والے‘ کفر کرنے والے‘ یہ سب اللہ کی نگاہ میں بالکل حقیر و ذلیل ہیں۔ اسی طرح علم کے ساتھ حلم کا ہونا بردباری کی انتہا ہے اور شکور کے ساتھ حلیم کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اعمالِ حسنہ کو قبول فرماتا‘ ان کو بڑھاتا‘ نیز اعمالِ سیئہ کے کفارہ میں دیر کرتا اور آہستگی کے ساتھ زمانۂ مستقبل تک اصلاح کی مہلت عطا فرماتا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَدْعُوْ عِنْدَ الْكَرْبِ يَقُوْلُ: ((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَرَبُّ الْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ)) ”نبی اکرم ﷺ رنج و غم میں یہ دعا پڑھتے تھے: ”اُس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو بہت ہی بزرگ اور بڑا ہی بردبار ہے۔ اُس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو عرشِ عظیم کا مالک ہے۔ اُس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو آسمانوں اور زمین کا رب اور عرشِ کریم کا ربّ ہے۔“

(۲۶) اَلْعَظِیْمُ

باری تعالیٰ اَلْعَظِیْمُ (بہت بڑا‘ صاحبِ عظمت) ہے۔ اہل زبان کے ہاں جب ایک شے کی بڑائی دوسری پر بیان کرنی ہو تو لفظ عظیم کا استعمال کیا جاتا ہے۔ سورۃ النمل میں ارشاد ہے: ﴿وَلَهَا عَرْشٌ عَظِیْمٌ ۝۲۳﴾ ”اور اُس کا تخت بہت عظیم الشان ہے۔“ سورۃ النور میں فرمایا: ﴿هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ ۝۱۶﴾ ”یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے!“ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِیْمًا ۝۴۰﴾ ”یہ تو تم بہت بڑی (گستاخی کی) بات کہتے ہو!“ سورۃ النساء میں فرمایا: ﴿وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا ۝۱۱۳﴾ ”اور یقیناً اللہ کا فضل ہے آپ پر

بہت بڑا۔'' سورۃ الاحزاب میں فرمایا:﴿اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾﴾ ''اللہ نے ان سب کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔''

اَلْعَظِیْم وہ ذات ہے جس کی عظمت و بڑائی کو دوسرا کوئی بھی نہ پا سکے' جس کا تصور بھی ناممکن ہو' جس ذات کی عظمت و بڑائی زمان و مکان سے پاک اور مبرا ہو' اور اس کی ساری عظمت ذاتی ہو۔ وہ ذاتِ الٰہی ربُّ العرشِ العظیم ہے' وہ فضلِ عظیم کا مالک ہے' وہ قرآنِ عظیم کا نازل کرنے والا ہے' وہ بندے کو کربِ عظیم سے نجات دلانے والا ہے' وہ ملکِ عظیم کا عطا کرنے والا ہے اور وہ نورِ عظیم تک بندوں کو لے جانے والا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾﴾ ''اور وہ بلند و بالا (اور) بڑی عظمت والا ہے۔'' سورۃ الواقعۃ میں ارشاد ہوا:﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۹۶﴾﴾ ''(اے نبیﷺ!) آپ تسبیح کیجیے اپنے ربّ کے نام کی جو کہ بہت عظمت والا ہے۔'' اسی حکم کی تعمیل میں دورانِ نماز رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم پڑھا جاتا ہے۔

(۲۷) اَلْغَفُوْرُ

غَفّار اور غَفُور دونوں اسم غُفران سے بطورِ صیغہ مبالغہ مستعمل ہیں۔ غفّار کے معنی کا تعلق مغفور بندوں کی تعداد سے ہے' یعنی غفّار وہ ذات ہے جو حد سے زیادہ تعداد کے گناہوں کو معاف کرے' اور غفور کے معنی میں مغفرت کا زائد از مقدار ہونا واضح ہوتا ہے' یعنی غفور وہ ذات ہے جس کی عطا و بخشش بغیر کسی انتہا کے ہو۔ ذاتِ باری تعالیٰ الْغَفُور (بہت بخشنے والا' معاف کرنے والا' بے انتہا مغفرت کا مالک) ہے یعنی وہ ذات جس کی مغفرت اتنے اعلیٰ درجے پر ہو کہ پھر کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ سورۃ الحجر میں ارشاد ہوتا ہے:﴿نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾﴾ ''(اے نبیﷺ!) میرے بندوں کو بتا دیجیے کہ میں یقیناً بہت بخشنے والا' نہایت رحم کرنے والا ہوں۔'' سورۃ النساء میں فرمایا:﴿وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾﴾ ''اور یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا' بہت رحم کرنے والا ہے۔'' سورۃ النساء میں دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾﴾ ''اور اللہ واقعتاً' معاف فرمانے والا' بخشنے والا ہے۔'' سورۃ القصص میں فرمایا:﴿اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶﴾﴾ ''یقیناً وہی ہے بڑا بخشنے والا' رحم فرمانے والا۔'' سورۃ فاطر میں ارشاد ہوا:﴿اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾﴾ ''یقیناً اللہ بہت زبردست ہے'

نہایت بخشنے والا۔'' مزید فرمایا:﴿اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۴﴾﴾ ''یقیناً ہمارا رب بہت بخشنے والا' بہت قدر افزائی فرمانے والا ہے۔'' صحیحین میں حضور اکرمﷺ سے ایک دعا نقل کی گئی ہے:((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْمًا كَثِيْرًا وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْ لِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ)) ''اے اللہ! میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے سوا گناہوں کا بخشنے والا کوئی نہیں ہے' تو اپنی (خاص) مغفرت سے میرے گناہ بخش دے اور مجھ پر رحم فرما' بے شک تو بڑا بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔''

(۲۸) اَلشَّكُوْرُ

یہ شکر سے ہے۔ شکر کے چند معانی ہیں اور خدائے بزرگ و برتر کا شَکُور ہونا ان سب معانی سے متعلق ہے۔ شکر کا ایک معنی مدح و ثنا بیان کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ شَکُور ہے کیونکہ اُس نے اپنی ذات کی خود مدح و ثنا فرمائی ہے اور اپنی صفاتِ عالیہ خود بیان کی ہیں۔ الشَّکُور بمعنی قدردان' بڑا قدر کرنے والا اور اطاعتوں کی قدر افزائی کرنے والا۔ شکر کا ایک معنی کسی کام کا قبول کرنا اور کسی خدمت سے راضی ہو جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ شَکُور ہے' کیونکہ وہ بندوں کے اعمالِ صالحہ کو قبول فرماتا ہے اور ان کی عبادات و طاعات سے راضی ہو جاتا ہے۔ سورۃ فاطر میں فرمایا:﴿اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۰﴾﴾ ''یقیناً وہ بہت بخشنے والا' بہت قدر دان ہے۔'' آگے مزید فرمایا: ﴿اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۴﴾﴾ ''یقیناً ہمارا ربّ بہت بخشنے والا' بہت قدر افزائی فرمانے والا ہے۔'' سورۃ التغابن میں ارشاد ہے:﴿وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور اللہ شکور (یعنی قدردان) بھی ہے اور حلیم (یعنی بردبار) بھی۔'' ربّ کائنات' الشَّکُور (بڑا قدر کرنے والا' قدردان' اطاعتوں کی قدر افزائی کرنے والا) ہے۔ وہ اپنے بندوں کو توفیقِ شکر دیتا ہے' وہ اپنے شاکرین کے شکر کو قبول فرماتا ہے' وہ شکر کرنے والوں کی زیادہ قدردانی فرماتا ہے اور جو بندے اس کا شکر کرتے ہیں' انہیں مزید نوازتا ہے۔ سورۃ ابراہیم میں ارشادِ الٰہی ہے:﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ﴿۷﴾﴾ ''اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا' اور اگر تم کفرانِ نعمت کرو گے تو یقیناً میرا عذاب بھی بہت سخت ہے۔'' صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز (تہجد) پڑھتے تو طویل قیام کرتے' یہاں تک کہ آپؐ کے قدم مبارک سوج جاتے۔ حضرت عائشہ ؓ نے عرض کیا:

اے اللہ کے رسول ﷺ! آپؐ ایسا کرتے ہیں' حالانکہ آپ کی اگلی پچھلی تمام خطاؤں کی مغفرت کی (یقین دہانی کرائی) جا چکی ہے! اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((یَا عَائِشَةُ: أَفَلَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا؟)) ''اے عائشہ! کیا میں (اللہ تعالیٰ کا) شکر گزار بندہ نہ بنوں؟''

(۲۹) اَلْعَلِیُّ

یہ عُلُو سے ہے جس کے معنی بلندی' بزرگی' بلندیٔ مرتبہ اور غلبہ کے ہیں۔ اَلْعَلِیّ (بلند و بالا اور برتر) یعنی وہ ذات جو بلند ہے' ایسی بلند کہ جس کے رتبے سے بڑا کوئی اور رتبہ نہیں ہے۔ اس کے مرتبے کے نیچے ہی دیگر تمام مراتب ہیں۔ علا النھار (دن چڑھ آیا)' علا الدّابۃ (گھوڑے پر سوار ہو گیا)' علا فی المکارم (خصائل بزرگی میں برتر ہو گیا)' علا بالامر (حکومت میں آگے بڑھ گیا یا مستقل ہو گیا)۔ اللہ تعالیٰ العَلِیُّ ہے کہ وہ سب پر غالب اور توانا ہے۔ اللہ تعالیٰ العَلِیُّ ہے کہ ارتفاعِ مراتب اُسی کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ العَلِیُّ ہے کہ وہ جملہ سفلیات و علویات سے بالاتر ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں فرمایا: ﴿اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ ۝۵۱﴾ ''وہ بہت بلند و بالا' کمال حکمت والا ہے۔'' سورۃ المؤمن میں فرمایا: ﴿فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِیِّ الْكَبِیْرِ ۝۱۲﴾ ''تو اب کل اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے جو بہت بلند' بہت عظمت والا ہے۔'' سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا: ﴿وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۝۲۵۵﴾ ''اور وہ بلند و بالا (اور) بڑی عظمت والا ہے۔''

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ علو ربانی' حکمت و کبریائی اور عظمتِ الٰہی کے ساتھ ہے۔ عَلِیٌّ وہی ذاتِ الٰہی ہے جو اپنے خاص برگزیدہ رسولوں اور نبیوں کے لیے بہترین تعریف کو دنیا میں قائم فرماتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل و اولاد کے حوالے سے سورۂ مریم میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِیًّا ۝۵۰﴾ ''اور ہم نے ان کو اعلیٰ درجے کی سچّی شہرت عطا فرمائی۔'' بے شک عَلِیّ وہی ذاتِ باری تعالیٰ ہے جس کا نام بلند' جس کا حکم بلند اور جس کی شان بلند ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۴۰ میں فرمایا: ﴿وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا ؕ﴾ ''اور اللہ ہی کا کلمہ سب سے اونچا ہے۔''

واضح رہے کہ اسی مادہ سے اللہ تعالیٰ کی صفت اور عَلَم باسم اَعْلٰی بھی قرآن مجید میں آیا ہے۔ صفات کے حوالے سے' سورۃ النحل کی آیت ۶۰ میں فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی ؕ﴾ ''اور اللہ کے لیے تو بہت ہی بلند مثال (صفت) ہے۔'' سورۃ الروم کی آیت ۲۷ میں ارشاد ہوتا

ہے: ﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ ''اور اُسی (اللہ) کی بہترین اور اعلیٰ مثال ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی''۔ بطور عَلَم سورۃ الاعلیٰ میں فرمایا: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَی ۝۱﴾ ''(اے نبی ﷺ!) اپنے بہت ہی بلند ربّ کے نام کی پاکیزگی بیان کرو۔'' حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اس کے جواب میں ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' پڑھا کرتے تھے۔ سورۃ اللیل میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی ۝۲۰﴾ ''بلکہ صرف اپنے پروردگار بزرگ و بلند کی رضا چاہنے کے لیے (متقی شخص عمل کرتا ہے)۔''

(۳۰) اَلْكَبِیْرُ

یہ کبر سے ہے۔ اہلِ دنیا میں کبر کا استعمال خصوصاً عمر میں بڑا ہونے کے حوالے سے ہوتا ہے۔ اردو میں بھی کبرسنی کا لفظ مستعمل ہے۔ مطلقاً بزرگی و بزرگ بھی اس کے معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ الکبیر (بڑا' برتر) ہے۔ وہ ہر شے سے بڑا ہے' کیونکہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ ہر شے سے بے نیاز اور بے پروا ہے۔ کبیر سے مراد صاحبِ کبر اور کبریاء سے مراد ذاتِ کمال ہے' اور کمالِ ذات کا معنیٰ کمالِ وجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کبیر ہے اور جملہ موجوداتِ زمانی و غیر زمانی پر اسے سبقت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کبیر ہے اور اس کی کبریائی کے سامنے ہر ایک ادنیٰ ترین صغیر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کبیر ہے جو خاص اپنے بندوں پر فضل کبیر کرتا ہے' جو مخلصین اہل طاعت کو فوز کبیر تک پہنچاتا ہے۔ سورۃ الحج میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ ۝۶۲﴾ ''یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور یہ کہ جس کو یہ لوگ اُس کے سوا پکارتے ہیں وہ سب باطل ہے اور یہ کہ یقیناً اللہ ہی سب سے بلند اور سب سے بڑا ہے۔'' سورۃ الرعد میں فرمایا: ﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِیْرُ الْمُتَعَالِ ۝۹﴾ ''وہ جاننے والا ہے غیب اور ظاہر کا' (وہ) بہت بڑا' بہت بلندی والا ہے۔'' سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ ۝۳۰﴾ ''اور یقیناً اللہ ہی سب سے بلند و بالا اور عظمت والا ہے۔'' سورۃ المؤمن میں فرمایا: ﴿فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِیِّ الْكَبِیْرِ ۝۱۲﴾ ''تو اب کل اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے جو بہت بلند' بہت عظمت والا ہے۔'' سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا: ﴿سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِیْرًا ۝۴۳﴾ ''وہ پاک ہے اور بہت ہی بلند و برتر ہے ان باتوں سے جو یہ کہہ رہے ہیں۔'' نبی کریم ﷺ نے ہمیں ایک بڑی

خوبصورت دعا سکھائی ہے: ((اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا))
''اے اللہ! مجھے میری نگاہ میں چھوٹا بنا دیجیے اور لوگوں کی نظروں میں مجھے بڑا بنا دیجیے۔''

(۳۱) اَلْحَفِیْظُ

حفیظ کے معنی حفاظت کرنے والا' نگہبان اور نگران کے ہیں۔ وہ ذاتِ باری تعالیٰ جو ہر چیز کی ہمیشہ نگران اور نگہبان ہے' چاہے وہ زمین کے اوپر ہو' اندر ہو' نیچے ہو' یا آسمانوں میں ہو۔ وہ ذات مؤمن اور کافر ہر ایک کی نگہبان ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے اور ہر چیز اس کی نگرانی میں ہے۔ وہ اپنی کسی بھی مخلوق اور اُس کے اعمال سے غافل نہیں۔ روزِ آخرت وہ ہر ایک کو اُس کے کیے کا بدلہ دے گا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۵ میں فرمایا: ﴿وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا ج﴾ ''اور اُس پر گراں نہیں گزرتی ان دونوں (آسمان وزمین) کی حفاظت۔'' سورۂ سبا میں فرمایا: ﴿وَرَبُّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور آپؐ کا پروردگار ہر چیز پر نگران ہے۔'' سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوا: ﴿وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾﴾ ''اور ہم ہی اُن پر نگران تھے۔'' سورۂ یوسف میں ارشاد ہوا: ﴿فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ص وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾﴾ ''پس اللہ ہی بہترین محافظ ہے اور وہی تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔''

حضورِ اقدس ﷺ کے حوالے سے بھی یہ اسم قرآن پاک میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ النساء میں فرمایا: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾﴾ ''جس نے اطاعت کی رسول کی اُس نے اطاعت کی اللہ کی۔ اور جس نے روگردانی کی تو ہم نے آپؐ کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا ہے۔'' اللہ تعالیٰ ہی حفیظ ہے' جو اپنے بندوں کے لیے حَفَظَة (حفاظت کرنے والے فرشتے) مقرر فرماتا ہے۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا: ((اِحْفَظِ اللّٰہَ یَحْفَظْکَ، اِحْفَظِ اللّٰہَ تَجِدْہُ تُجَاھَکَ)) ''تم اللہ کو یاد رکھو' وہ تمہیں یاد رکھے گا' تم اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو' تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے (یعنی وہ گناہوں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔)'' (جامع ترمذی)

(جاری ہے)

❁❁❁

رابطہ دفاتر

لاہور	قرآن اکیڈمی K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور	042-35869501-3
	دار الاسلام، مرکز تنظیم اسلامی' 23 کلومیٹر' ملتان روڈ' چوہنگ' لاہور	042-35473375-9
	A-67' علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو لاہور	042-36293939
	مسجد بنت کعبہ N-866 پونچھ روڈ سمن آباد لاہور	042-37520902
کراچی	قرآن اکیڈمی DM-55' سٹریٹ نمبر 34 خیابانِ راحت، درخشاں ڈیفنس فیز 6' کراچی	021-35340022-24
	B-375' پہلی منزل' علامہ شبیر احمد عثمانی روڈ' بلاک 6' گلشن اقبال کراچی	021-34993436-7
	قرآن اکیڈمی یٰسین آباد شارع قرآن اکیڈمی' بلاک 9' فیڈرل بی ایریا' کراچی	021-36806561
	قرآن مرکز کورنگی متصل مسجد طیبہ' سیکٹر 35/A' زمان ٹاؤن' کورنگی نمبر 4' کراچی	021-35074664
	قرآن مرکز مکان نمبر 861' سیکٹر 37-D متصل رضوان سویٹس' لانڈھی نمبر 2' کراچی	0333-2815528
حیدرآباد	مسجد جامع القرآن، گلشنِ سحر قاسم آباد، حیدرآباد	022-2106187
سکھر	3/B پروفیسرز ہاؤسنگ سوسائٹی، شکارپور روڈ، سکھر	071-5807281
اسلام آباد	31/1 فیض آباد ہاؤسنگ سکیم، نزد فلائی اوور برج، I-8/4 اسلام آباد	051-2751014
راولپنڈی	مکان نمبر 139 ملت کالونی (مکھا سنگھ اسٹیٹ) نزد کمیٹی چوک راولپنڈی	051-4866055
گوجر خان	دفتر تنظیم اسلامی عقب شیل پمپ، نیو ہمگام جی ٹی روڈ گوجر خان	051-3510334
ملتان	قرآن اکیڈمی 25 آفیسرز کالونی بوسن روڈ ملتان	061-6520451
کوٹ ادو	قرآن اکیڈمی گڑھی قریشی، شیخ عمر روڈ، کوٹ ادو	0333-4009554
فیصل آباد	قرآن اکیڈمی، P-45 قرآن اکیڈمی روڈ' سعید کالونی نمبر 2' فیصل آباد	041-2437781
جھنگ	انجمن خدام القرآن جھنگ قرآن اکیڈمی' لالہ زار کالونی نمبر 2' ٹوبہ روڈ' جھنگ صدر	047-7630861-2-3
سرگودھا	مسجد جامع القرآن، مین روڈ سیٹلائیٹ ٹاؤن سرگودھا	0300 6056636
گجرات	مسجد تقویٰ، متصل گرین ٹاؤن چوکی جماپور روڈ، گجرات	053-3600937
پشاور	دفتر تنظیم اسلامی سعد اللہ جان کالونی، عقب ایڈمور پمپ، نزد ٹیلی فون ایکسچینج جی ٹی روڈ' پشاور	091-2262902
مالاکنڈ	مستقیم الیکٹرونکس ریسٹ ہاؤس چوک تیمر گرہ، ضلع دیر پائین، صوبہ خیبر پختونخوا	0343 0912306
کوئٹہ	بالائی منزل بالمقابل کوالٹی سویٹس منان چوک شارع اقبال کوئٹہ	081-2842969

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قائم کردہ طباعتی ادارے
مکتبہ خدام القرآن لاہور کی کتب حاصل کرنے کیلئے آفیشل آن لائن بک سٹور
www.maktaba.com.pk
0301 - 111 53 48
اپنا آرڈر بک کروانے کے لیے آپ اپنا پورا نام، کتاب کا نام، فون نمبر اور مکمل ایڈریس رومن انگلش میں لکھ کر اس نمبر پر واٹس ایپ کر دیں۔

Oct 2025
Vol.74

Regd. CPL No.115
No.10

Monthly **Meesaq** Lahore

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

• خوبصورت ٹائٹل • سفید کاغذ • معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں

(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)

مکمل سیٹ کی قیمت: 7000 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید

• قرآنی رسم الخط • تفسیری سائز • عمدہ سفید کاغذ • مضبوط مراکو جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں

مکمل سیٹ کی قیمت: 9600 روپے

مکتبہ خدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)